رجسٹر نمبر آصفیہ (۱۲۰)
جلد (۴) عدد (۴)

رجسٹر نمبر ایم (۲۹۵۰)
ربیع الثانی ۱۳۵۳ھ

۷۸۶

ماہنامہ

ترجمان القرآن

علوم قرآنی و حقایق فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

سید ابو الاعلیٰ مودودی

قیمت سالانہ (صہ) . بیرون ہند کے لئے (سے) قیمت فی پرچہ (۸)

الجہاد فی الاسلام

تالیف

ابوالاعلیٰ مودودی

اسلام کے جن مسائل پر مخالفین نے سب سے زیادہ حملے کئے ہیں ان میں سے ایک مسئلہ جہاد بھی ہے اس مسئلے پر ایسی شد و مد کے ساتھ اعتراضات کئے گئے کہ بہت سے مسلمان بھی ان سے مرعوب ہوگئے اور انہوں نے دشمنوں کے اعتراضات کو رفع کرنے کے لئے خود اسلام کے احکام اور اسکی تعلیمات میں قطع و برید شروع کردی۔ اسلام کے حامیوں کی جانب سے اس مسئلہ پر جو کچھ لکھا گیا وہ سب معذرت (Apology) کے انداز میں تھا جس سے صریح کمزوری اور مرعوبیت ظاہر ہوتی تھی۔ مولانا شبلی مرحوم اور مولانا ابوالکلام آزاد نے البتہ اس مسئلہ کو صاف کرنے کی کوشش کی مگر پورا پورا حق انکی تحریروں سے بھی ظاہر نہیں ہوا۔ ضرورت تھی کہ ایک مفصل کتاب اس موضوع پر لکھی جاتی جس میں جنگ کے متعلق اسلام کی تعلیم اور اسکے مقاصد اور احکام کو تفصیل کیساتھ صاف صاف بیان کردیا جاتا، اور دوسرے مذاہب اور قوموں کے اصول و قوانین جنگ سے مقابلہ کرکے ثابت کیا جاتا کہ اسلام کا جہاد اپنے مقاصد اور قواعد و ضوابط کے لحاظ سے سب پر فوقیت رکھتا ہے۔

"الجہاد فی الاسلام" نے اسی ضرورت کو پورا کیا ہے۔ یہ کتاب معذرت کے انداز میں نہیں بلکہ اظہار حق کے انداز میں لکھی گئی ہے، اور ضمناً اس میں ہندو مذہب، بودھ مت، مسیحیت، یہودیت اور قانون بین الاقوام (International Law) کے متعلق ایسے مباحث بھی آگئے ہیں جو ابھی تک اردو زبان کے لئے بالکل نئے ہیں۔ عام طور پر تسلیم کیا گیا ہے کہ اس موضوع پر ایسی کوئی کتاب نہ صرف اردو بلکہ کسی مشرقی یا مغربی زبان میں نہیں لکھی گئی۔

ضخامت (۵۰۰) صفحات قیمت بلاجلد (؎عہ) انگریزی (؎عہ) سکہ عثمانیہ (مجلد کی قیمت ؎ انگریزی ؎ سکہ عثمانیہ)

دفتر ترجمان القرآن سے طلب فرمایئے

فہرست مضامین

ماہ ربیع الثانی ۱۳۵۳ھ جلد ۴۔ عدد ۴

۱	اشارات	ابوالاعلیٰ مودودی	۲۲۶
۲	تفسیر سورۃ التین	مولوی اکرم علی صاحب محمدی	۲۳۷
۳	پاپولر	جناب چوہدری غلام احمد صاحب پرویز	۲۴۲
۴	شیخ محمد وارث عمادی	مولوی محمد عثمان صاحب عمادی	۲۶۰
۵	قرآن مجید کا انگریزی ترجمہ	مولانا عبدالماجد دریابادی	۲۶۶
۶	تبدیل جلود	مولانا عبداللہ العمادی	۲۷۹
۷	نقد و نظر	ا۔م	۲۹۵

معذرت۔ افسوس ہے کہ اس مرتبہ ایڈیٹر کی مسلسل بیماری کے سبب سے ان مضامین کا سلسلہ رک گیا ہے جو ترجمان القرآن میں شایع ہو رہے تھے۔ رسالے کی ترتیب بھی درست نہیں رہی ہے اور اشاعت بھی تاخیر سے ہو رہی ہے۔ انشاءاللہ آئندہ مہینے میں اس نقصان کی تلافی ہو جائیگی۔

منیجر

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اِشارات

پچھلے سال اسی مہینے میں آپ کو برٹش اینڈ فارن بائبل سوسائٹی کے وہ کارنامے سنائے گئے تھے جو اس نے سنہ ۳۱ء سے ۱۹۳۲ء تک انجام دیے ہیں۔ آج ہم اس سبق آموز داستان کا ایک دوسرا ورق پیش کرتے ہیں جو سنہ ۱۹۳۲-۳۳ء اور سنہ ۱۹۳۳-۳۴ء کی رپورٹوں سے اخذ کیا گیا ہے۔ یہ داستان سبق کھلنے والی ضرور ہے۔ مگر افسوس کہ ہم میں ابھی تک سبق سیکھنے والے پیدا نہیں ہوئے۔ کاش! سبق سنتے سنتے ہم میں سیکھنے اور عمل کرنے کی بھی صلاحیت پیدا ہو جائے۔

سنہ ۱۹۳۲-۳۳ء میں اس سوسائٹی نے دنیا کی ۱۲ نئی زبانوں میں بائبل کے ترجمے شائع کئے، جن میں سے چھ زبانیں ایشیا کی ہیں چار افریقہ کی، ایک امریکہ کی اور ایک یورپ کی۔ اس طرح اُن زبانوں کی تعداد ۶۶۷ تک پہنچ گئی جن میں بائبل کے تراجم شائع ہوئے ہیں۔

ایک سال کے اندر بائبل اور اس کے متفرق حصوں کے جتنے نسخے دنیا کی مختلف زبانوں میں شائع کئے گئے ان کی مجموعی تعداد (۱۰،۶۱،۷۴،۰) تھی جو سنہ ۱۹۳۱-۳۲ء کے مقابلہ میں ۶۵ ہزار کا اضافہ ہوا۔ ممالک کے لحاظ سے اس تعداد کی تقسیم حسب ذیل ہے۔

ایشیا	۶۹ ۵۰ ۰۰۰
یورپ	۱۶ ۹۰ ۰۰

جزائر برطانیہ	۸۵۷۰۰۰
جنوبی امریکہ	۴۹۸۰۰۰
افریقہ	۳۵۲۰۰۰
کنیڈا اور نیو فاؤنڈلینڈ	۳۱۷۰۰۰
آسٹریلیا	۱۷۰۰۰۰
نیوزی لینڈ	۳۴۰۰۰
اوشیانیا	۴۰۰۰

سب سے زیادہ اشاعت چین میں ہوئی جہاں بائبل اور اس کے مختلف حصوں کے ۴۲ لاکھ نسخے ایک سال کے اندر شائع ہوئے۔

ہندوستان میں صرف الہ آباد کی شاخ نے جس قدر کام کیا ہے اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ ایک سال میں ۲۳۶۶۱۹ نسخے تقسیم کئے گئے۔ جو ۴۰ مختلف زبانوں میں تھے۔ ۵۴ مردوں اور ۶ عورتوں نے گھر گھر پھر کر ۵۴ ہزار سے زیادہ نسخے فروخت کیے۔ یونیورسٹیوں کے امتحانات میں کامیابی حاصل کرنے والے طلبہ کو ۳۹۲ نسخے مکمل بائبل کے اور ۴۹۹ نسخے جدید عہد نامہ کے مفت دیئے گئے۔ اور ۴۵۴۹ روپے کے عطیے بائبل سوسائٹی کی امداد کے لئے وصول ہوئے۔

الہ آباد کی شاخ ۱۸۴۵ء میں قائم ہوئی تھی پہلے سال اس نے تقریباً ۱۰ ہزار نسخے شائع کئے۔ سنہ ۱۹۰۱ء میں یہ تعداد ۹۴ ہزار تک پہنچی۔ اور سنہ ۱۹۲۰ء میں ساڑھے چار لاکھ تک پہنچ گئی۔ ۵۰ سال کی مدت میں صرف اس شاخ سے بائبل کے جو نسخے شائع ہوئے ہیں، ان کی مجموعی تعداد ۷۷ لاکھ سے زیادہ ہے۔

اب سنہ ۳۴-۱۹۳۳ء کی روداد سنیے۔

تمام دنیا میں ۱۰۹۳۳۲۰۳ نسخے شائع ہوئے جو بمقابلہ سال گذشتہ کے ۳ لاکھ زیادہ تھے۔ ممالک کے لحاظ سے تقسیم حسب ذیل ہے۔

۱۔ یورپ	۱۵۸۹۰۰۰	مغربی یورپ	۱۰۳۴۱۱۴
		وسطی یورپ	۳۰۸۰۰۰
		شمالی مشرقی یورپ	۷۵۰۰۰
		جنوبی مشرقی یورپ	۱۷۱۰۰۰
۲۔ ایشیا	۶۷۰۸۰۰۰	چین	۳۹۰۲۰۰۰
		کوریا	۶۵۵۰۰۰
		ملایا	۱۷۸۰۰۰
		سیلون اور ہندوستان	۱۱۸۷۰۰۰
		برما	۱۴۴۰۰۰
		جاپان	۵۴۱۰۰۰
		ایران و عراق	۶۹۰۰۰
		فلسطین و شام	۳۸۰۰۰
۳۔ افریقہ	۵۰۹۰۰۰		
۴۔ جنوبی امریکہ	۴۴۳۰۰۰		
۵۔ کینیڈا اور نیوفاونڈ لینڈ	۲۷۶۰۰۰		
۶۔ نیوزی لینڈ	۲۵۰۰۰		

۷۔ آسٹریلیا ۱۷۲۰۰۰

۸۔ برطانیہ عظمیٰ ۸۴۴۴۵۵

یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ یورپ میں بائبل کی اشاعت گھٹ رہی ہے۔ اسپین، فرانس، سوئٹزرلینڈ، اٹلی، بلجیم، جرمنی، زیکوسلوواکیا، یوگوسلیویا، یونان، لتھوانیا، فن لینڈ اور خود بائبل سوسائٹی کے گھر یعنی جزائر برطانیہ کے اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر جگہ سال گذشتہ کے مقابلہ میں ہزاروں کی کمی ہوئی ہے لیکن مشرقی ممالک میں بشتر ایسے ہیں جو گذشتہ سال کے مقابلہ میں اس سال بائبل کے زیادہ خریدار نظر آتے ہیں مثلاً ہندوستان میں ۹۵ ہزار کا اضافہ ہوا ہے۔ برما میں ۴۴ ہزار، جاپان میں ۱۵ ہزار، ایران و عراق اور فلسطین و شام میں ۴ ہزار، شمالی افریقہ میں ۶ ہزار، استوائی افریقہ میں ۱۰ ہزار، وسط جنوبی افریقہ میں ۵۵ ہزار، نٹال میں ۳ ہزار، اور کیپ کے علاقہ میں ۸۰ ہزار کی بیشی ہوئی ہے۔

جاپان میں بائبل کی اشاعت جس رفتار سے بڑھ رہی ہے اس کا اندازہ اس سے ہو گا کہ چار بغری گشتوں نے ایک سال میں تین تین ہزار سے زائد نسخے فروخت کئے۔ اور ایک کے فروخت کردہ نسخوں کی تعداد تو ۵۴ ہزار تک پہنچ گئی۔

اس سال ۱۱ نئی زبانوں میں بائبل کا ترجمہ ہوا جن میں سے ۹ زبانیں افریقہ کی ہیں۔ ایک یورپ کی اور ایک اوشیانیا کی۔ اس طرح ان زبانوں کی تعداد ۶۷۰ تک پہنچ گئی ہے جن میں اب تک بائبل یا اس کے بعض حصوں کے ترجمے شایع ہو چکے ہیں۔

جن نئی زبانوں میں اس سال تراجم شائع کئے گئے ہیں ان کا بھی مختصر حال سن لیجئے۔

نائیجریا کی کمبری زبان جس کے بولنے والے ۴۵۰۰۰ ہیں۔

نائیجیریا کی ڈاکا زبان جس کے بولنے والے ۲۰۰۰۰ ہیں
استوائی افریقہ کی یاکا " " ۱۵۰۰۰ "
" لمبو " " ۱۵۰۰۰ "
" بایا " جس میں خواندہ لوگوں کی تعداد صرف ایک ہزار ہے
نیکا " جس کو زیادہ تر مسلمان بولتے ہیں۔
سوڈان کی بابی زبان جس کے بولنے والے اسلامی علاقوں سے محصور ہیں۔
حبش کی سیڈاموزبان جس کے بولنے والے ۱۵۰۰۰ ہیں۔
اوسٹیانیا کی کومینی زبان جس کے بولنے والے ۲۵۰۰ "

یہ اعداد خود اپنی خاموش زبان سے کہہ رہے ہیں کہ دنیا کے دور دراز علاقوں میں اگر کسی زبان کو چار دو ہزار انسان بھی بولتے ہیں تو اس میں بائبل منتقل کر دی گئی ہے، تاکہ یہ لوگ خود اپنی زبان میں اس کتاب کو پڑھ سکیں اور مسیحیت کا پیغام سمجھ سکیں۔

پھر یہ بھی نہیں ہے کہ ترجمے محض سرسری طور پر رواروی میں کر دیے گئے ہوں۔ ان میں سے بیشتر تراجم ایسے ہیں جو کئی کئی آدمیوں نے مل کر کیے ہیں۔ بار بار ان کی نظر ثانی کی گئی ہے۔ دیسی باشندوں کو خاص طور پر تعلیم دے کر اس لئے طیار کیا گیا ہے کہ ترجمہ اور نظر ثانی میں مدد دے سکیں۔

حال ہی بائبل کا سب سے اہم ترجمہ وہ ہے جو افریقان بائبل کے نام سے مشہور ہے۔ افریقانی زبان جنوبی افریقہ کی عام زبان ہے۔ اب تک وہاں ولندیزی زبان کی بائبل رائج تھی جس کو عوام نہ سمجھ سکتے تھے۔ بائبل سوسائٹی نے مترجموں کا ایک بورڈ اس زبان میں کتاب مقدس کا ترجمہ کرنے کے لئے مقرر کیا جس نے دس سال کی مسلسل محنتوں کے بعد پچھلے سال اس کام کو مکمل کیا ہے۔ سال رواں میں پہلی مرتبہ اس ترجمہ کے ۲۲۰۰۰ نسخے

طبع کر کے جنوبی افریقہ بھیجے گئے اور سب کے سب فروخت ہو گئے۔ اس ترجمہ کی اشاعت کا اثر یہ ہوا کہ مسیحیت جو جنوبی افریقہ میں مردہ ہوتی چلی جا رہی تھی، یکایک جی اٹھی۔ کلیسا پھر سے بھرنے شروع ہو گئے اور گھروں میں اہل خاندان کے مل کر دعا کرنے کا طریقہ جو قریب قریب موقوف ہو چکا تھا از سر نو جاری ہو گیا۔

اب کچھ تھوڑا سا حال ان لوگوں کا بھی سن لیجیے جنہوں نے دنیا کی مختلف زبانوں میں بائبل کے ترجمے کئے ہیں۔ ہم ان کی طویل فہرست میں سے صرف چھ مثالیں پیش کریں گے تاکہ یہ داستان زیادہ طویل نہ ہو جائے، اور چند نمونوں سے آپ اس دین پرست جماعت کے جذبۂ خدمت کا اندازہ لگا لیں۔

بورنیو کے جنگلوں میں ایک قوم ڈایک نامی رہتی ہے جس کے چند قبائل سراوک کی ریاست میں آباد ہیں اس قوم کی زبان کا نام بھی ڈایک ہی ہے۔ اب سے ستر برس پہلے وہاں جی مبلغین نے کام شروع کیا اور بہت سے خاندانوں کو عیسائی بنا لیا۔ اس وقت تک ڈایک زبان میں تحریر کا رواج نہ تھا مشنریوں نے ان کے لئے ایک رسم الخط ایجاد کیا مدارس قائم کئے اور اس حد تک تعلیم پھیلا دی کہ اب کم از کم ہر گھر میں ایک لکھا پڑھا آدمی موجود ہے اس طرح زمین طیار کر لینے کے بعد بائبل کا ترجمہ شروع کیا گیا۔ ان کی زبان میں الفاظ کی بہت کمی تھی اور جو تھوڑے بہت الفاظ تھے بھی تو وہ وسیع معانی کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ سالہا سال کی کوششوں کے بعد اس زبان کو اس قابل بنایا گیا کہ بائبل کے مضامین اس میں ادا ہو سکیں، اور ابھی پچھلے سال اناجیل اربعہ کا مکمل ترجمہ ڈایک میں شائع ہوا ہے

وسط افریقہ میں ایک زبان بولی جاتی ہے جس کا نام بن ٹو ہے، اس کے بولنے والے بھی بالکل وحشی تھے مشنریوں نے جا کر ان کے درمیان پوری پوری عمریں گذاریں۔ ان کی زبان سیکھی۔ اس کے لئے رسم الخط ایجاد کیا۔ اس کی گرامر مرتب کی۔ قاموس بنائی۔ مدرسے قائم کر کے لکھنا پڑھنا سکھایا۔ اس کے بعد بائبل کا ترجمہ شائع کیا

سب سے پہلے لٹریچر کی جس کتاب سے یہ لوگ آشنا ہوئے وہ یہی بائبل تھی اس سے انکے اندر دفعتہ ایک نئی زندگی پیدا ہوگئی اینڈ
لوگوں کے بچے جب کتابیں پڑھتے تو ان کے خاندان والے اس عجیب تماشے کو دیکھنے کے لئے جمع ہوجاتے تھے،
اور بسا اوقات ایک ایک بچے کی زبان سے پورا پورا گاؤں بائبل سنتا تھا۔ ان مناظر نے پوری قوم میں علم حاصل
کرنے کا شوق پیدا کردیا۔ اور اس اچھوتی زمین میں مسیحیت کی پہلی ہی تخم ریزی خوب بارآور ہوئی۔

بن ٹو زبان میں بائبل کا پہلا ترجمہ ناقص تھا۔ مشنریوں کے جو بچے اس سرزمین میں پیدا ہوئے تھے، اور
جن کے لئے بن ٹو زبان مادری زبان کی حیثیت رکھتی تھی، وہ اب بڑے ہوکر اس ترجمہ پر نظرثانی کررہے ہیں۔

مغربی افریقہ میں ساحل سمندر سے ایک ہزار میل کے فاصلہ پر ایک قوم رہتی ہے جس کا نام ٹانگالیس ہے
۴۰ ہزار کے قریب ان کی آبادی ہے۔ علم و تہذیب تو در کنار۔ کپڑوں تک سے ناآشنا۔ زیادہ سے زیادہ لباس جو
ان کے ہاں مستعمل ہوتا ہے وہ کچی کھالیں اور تازہ پتے ہیں۔ نہایت مشکل اور بے ڈھنگی زبان بولتے ہیں جس کو قید
تحریر میں لانا محال معلوم ہوتا تھا۔ مگر مسیحی مشنری کا جذبۂ عمل ان تمام مشکلات پر غالب آگیا۔ ۱۹۲۰ء میں لوقا کی
انجیل ان کی زبان میں شائع کی گئی۔ اور ۱۹۳۰ء میں پورا عہدنامۂ جدید خود اس علاقہ کے ایک پریس میں چھاپ دیا
گیا۔ اس وقت وہاں تین سو مدرسے قائم ہیں۔ خود وہیں کے چند آدمی جو ابتدائً عیسائی ہوگئے تھے اور جنہیں مشنریوں
نے پڑھا لکھا دیا تھا، ان مدرسوں کو چلا رہے ہیں۔ استاد اپنے کھیتوں میں محنت کرتے، اور فرصت کے اوقات
مفت تعلیم دینے میں صرف کردیتے ہیں۔ مدرسوں کی عمارتیں بھی دیسی باشندوں نے خود بنالی ہیں۔ مشنریوں کو ایک پیسہ
اپنے پاس سے صرف کرنا نہیں پڑتا۔

جنوبی افریقہ کے اندرونی علاقوں میں ایک قوم سوتو زبان بولتی ہے۔ ۱۸۳۰ء میں ایک نوجوان مشنری
اڈولف مابل نامی اپنی بیوی سمیت وہاں جاکر رہا اور پورے ۴۳ سال وہیں گزار دئے۔ اس نے وہاں ایک

نارمل اسکول قائم کرکے اساتذہ تیار کرنے شروع کئے۔ اس مدرسہ کی ابتدا صرف تین آدمیوں سے ہوئی تھی۔ بعد میں اس سے اتنے اساتذہ تیار ہوئے کہ سارے ملک میں تعلیم دینے کے لئے پھیل گئے۔ پھر اس نے بائیبل اسکول اور دینیات کی تعلیم کا مدرسہ قائم کیا اور ایک مطبع کھولا اور ایک رسالہ نکالا جس کو ابتداءً وہ خود ہی لکھتا اور خود چھاپتا تھا۔ پھر اس نے سات آدمیوں کی مدد سے بائیبل کا ترجمہ شروع کیا، اور بیس سال کی لگاتار محنت کے بعد اس کو مکمل کرکے چھوڑا۔ وہ اپنے حالات میں لکھتا ہے کہ ہر کتاب کا ترجمہ مکمل کرنے کے بعد ہم اس پر کئی کئی مرتبہ نظر ڈالتے اور اگر اطمینان نہ ہوتا تو اس کو ردی کرکے پھر ترجمہ کرتے۔ بعض اوقات ہم کو ایک ایک کتاب کا ترجمہ چار چار مرتبہ کرنا پڑا۔ اس محنت شاقہ کے ساتھ ۱۳ تبلیغی مراکز اور ۱۳ مدرسوں کی نگرانی بھی وہ خود کرتا تھا، رسالے اور پریس کا کام بھی انجام دیتا تھا، اور چار گھنٹے روزانہ پڑھاتا بھی تھا۔

ایک دوسرے شخص ڈاکٹر ایڈورڈ اسٹیر کا کارنامہ بھی کچھ کم حیرت انگیز نہیں ہے۔ یہ لنڈن یونیورسٹی کا گریجویٹ، قانون کا ڈاکٹر، فن قانون کی مہارت میں سونے کا تمغہ پائے ہوئے تھا۔ باپ چاہتا تھا کہ بیرسٹری کرے مگر اس نے فلسفہ و الٰہیات کا مطالعہ کیا اور اپنی زندگی مسیحیت کی خدمت کیلئے وقف کردی۔ ۱۸۶۴ء میں زنجبار کے بشپ ٹوزر کے ساتھ مشرقی افریقہ گیا، اور وہاں ایک مدرسہ جاری کیا جس میں ابتداءً صرف پانچ زنگی لڑکے تھے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے سواحلی زبان سیکھنی شروع کی جو افریقہ کی سب سے زیادہ عام تجارتی زبان ہے، اور برّ اعظم کے اندرونی علاقوں میں دور دور تک پھیلی ہوئی ہے۔ اس زبان میں کافی مہارت حاصل کرنے کے بعد اس نے پہلے متی کی انجیل کا ترجمہ کیا جو ۱۸۶۹ء میں لنڈن سے شائع ہوا۔ پھر ۱۸۸۲ء میں وہ پورے عہد نامہ جدید کا ترجمہ لے کر خود انگلستان گیا اور اسے اپنی نگرانی میں طبع کرایا۔ اس کے بعد اس نے عہد عتیق کا ترجمہ شروع کیا مگر عمر نے وفا نہ کی، ایک روز اچانک وہ اپنے کمرے میں مردہ پایا گیا۔ اس کی میز پر ترجمہ کا مسودہ پڑا ہوا تھا اور آیندہ کام جاری رکھنے کے لئے ہدایات لکھی ہوئی موجود تھیں۔

سیموئیل پولرڈ بھی اسی طرح کا ایک صاحب عزم مشنری تھا۔ ۱۸۸۷ء سے چین میں تبلیغ مسیحیت کر رہا تھا۔ ۱۹۰۴ء میں چین کے ایک نیم وحشی قبیلہ میاؤ سے اس کے تعلقات ہوئے اور اس نے ۴۰ برس کی عمر میں ان کی زبان سیکھنی شروع کی۔ ان کی زبان میں تحریر کا نام و نشان تک نہ تھا۔ اس نے ایک آسان سا رسم الخط ایجاد کیا اور قلیل مدت میں سینکڑوں آدمیوں کو لکھا پڑھا دیا۔ پھر اس نے عہد جدید کا ترجمہ ان کی زبان میں شروع کیا ۱۹۰۷ء میں مرقس کی انجیل شائع کی۔ ۱۹۱۵ء میں پورا عہد جدید شائع کر دیا آگے بڑھنا چاہتا تھا کہ قضا کا پیغام آگیا اپنے حالات میں لکھتا ہے کہ میرے لئے اس سے بڑھکر خوشی کی کوئی بات نہیں کہ یہ لوگ سب سے پہلے جس کتاب کو پڑھیں گے وہ مسیح کی کتاب ہوگی۔"

آپ دیکھ رہے ہیں کہ مسیحیت اپنی کمزوریوں کے باوجود دنیا کے ہر حصہ میں پھیلتی چلی جا رہی ہے، اور آبادیاں کی آبادیاں کلیسا کے دائرے میں داخل ہو رہی ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو ظاہر میں سب کو نظر آتی ہے۔ یعنی عیسائی قوموں کی دولت، ان کے تمدنی اثرات اور ان کی سیاسی طاقت لیکن اس ظاہر کی تہ میں جو ایثار جو قربانیاں، جو فداکاریاں، جو حیرت انگیز محنتیں اور کوششیں کام کر رہی ہیں، ان کا حال کم لوگوں کو معلوم ہے حالانکہ درحقیقت مسیحیت کے پھیلنے میں عیسائی قوموں کی مادی طاقتوں کا اتنا حصہ نہیں ہے جتنا عیسائی مشنریوں کی ان محنتوں اور پرخلوص جد و جہد کا حصہ ہے۔ اگر ان میں خدمت دین کا یہ زبردست جذبہ نہ ہوتا تو محض دولت اور تمدن اور سیاسی قوت کے بل پر مسیحیت کو کبھی یہ فروغ نصیب نہ ہوتا۔

یہ دنیا دار العمل ہے۔ یہاں کا قانون یہی ہے کہ جو اپنے مقصد کے لئے جان و مال اور آرام و آسایش کو قربان کرے گا وہی کامیاب ہوگا۔

غور تو کیجئے کہ ایک مشنری انگلستان جیسے متمدن ملک میں پیدا ہوتا ہے، عیش و عشرت کے ماحول میں آنکھیں کھولتا ہے، اعلیٰ درجہ کی تعلیم حاصل کرتا ہے۔ مادی ترقیوں کے امکانات اس کے استقبال کو موجود ہوتے ہیں۔ مگر وہ ان سب کو چھوڑ کر اپنے وطن سے دور صحراؤں میں انتہا درجہ کی وحشی قوموں کے درمیان جا بیٹھتا ہے جہاں کی ہر چیز اس کے مزاج، اس کی عادات اور اس کے ذہنی و جسمانی مالوفات کے بالکل خلاف ہے۔ اس وحشت کی دنیا میں یہ متمدن اور تعلیم یافتہ انسان سال دو سال نہیں تیس تیس اور چالیس چالیس سال گذار دیتا ہے۔ جوان جاتا ہے اور بوڑھا واپس آتا ہے، بلکہ بسا اوقات اس کو پھر اپنا وطن دیکھنا نصیب ہی نہیں ہوتا۔ وہ ان وحشی قوموں میں اس طرح رہتا ہے جیسے ان ہی میں کا ایک آدمی ہے۔ لگاتار محنتوں سے اُن کے توحش کو دور کر کے ان میں علم کا شوق اور مذہب کا ذوق پیدا کرتا ہے۔ سینکڑوں بلکہ ہزاروں برس سے جو زمینیں بنجر پڑی ہوئی ہیں ان میں آبیاشیاں اور تخم ریزیاں کرتا ہے، اور ہزار مرتبہ ناکامیوں سے دوچار ہونے کے بعد بھی ہمت نہیں ہارتا، مایوس نہیں ہوتا، پھر محنت کرتا ہے اور پھر کوشش کرتا ہے۔ کیا یہ قربانیاں اور محنتیں رائگاں جا سکتی ہیں؟ کیا ایسے اولوا العزم اور اپنے مقصد کے پیچھے جانیں لڑا دینے والے لوگ ناکام رہ سکتے ہیں؟ اگر کامیابیاں ایسے لوگوں کے قدم نہ چومیں گی تو کیا ان لوگوں کی قدمبوسی کریں گی جو صرف زبان سے مذہب پر جان دیتے ہیں، مگر اپنے کسی فائدے اور کسی لذت اور کسی لطف کو اس پر قربان کرنے کے لئے طیار نہیں، مسندوں پر گاؤ تکیے لگا کر بیٹھتے ہیں، معتقدوں اور شاگردوں سے خدمتیں لیتے ہیں۔ بہتر سے بہتر کھانے اور عمدہ سے عمدہ لباس، اور اچھے سے اچھے مکان کے بغیر گزر نہیں کر سکتے۔ عقیدتمندوں کے جھمگٹ میں بیٹھ کر تقریریں کرتے ہیں۔ ہر طرف سے احسنت و مرحبا کے شور سنتے ہیں اور اس زندگی کو سمجھتے ہیں کہ یہ دین کی خدمت میں بسر ہو رہی ہے۔

عیسائی تو اس جوش اور خلوص اور محنت کے ساتھ اس کتاب کی خدمت کر رہے ہیں جس کے محرف ہونے کا خود ان کو بھی علم ہے۔ وہ بھی جانتے ہیں کہ یہ خدا کا کلام نہیں ہے مسیح کا کلام بھی نہیں ہے مسیح کے خاص

حواریوں کا کلام بھی نہیں ہے۔ بلکہ جن کی طرف منسوب ہے ان کی طرف بھی اس کی نسبت مشکوک ہے۔ بخلاف اسکے ہمارے پاس وہ کتاب ہے جس کے خاص کلام الٰہی ہونے کا ہم کو علم اور یقین ہے۔ ہم جانتے اور مانتے ہیں کہ یہ کتاب رحمت کا منبع اور ہدایت کا سرچشمہ ہے۔ ہم کو معلوم ہے کہ دنیا جس آب حیات کی پیاسی ہے، اور جس کے دھوکے میں ہر سراب کی طرف دوڑ رہی ہے، وہ دراصل اسی سرچشمہ کا پانی ہے، مگر ہم کو گریبانوں میں منہ ڈالکر دیکھنا چاہئے کہ اس کتاب کے نور کو پھیلانے کے لئے ہم کیا کوشش کر رہے ہیں؟ عیسائیوں میں اڈولف ہابل اور ڈاکٹر اشپر جیسے سینکڑوں موجود ہیں۔ مگر ہم ان کا سا ایک آدمی بھی نہیں رکھتے۔ عیسائی ۶۰۸ زبانوں میں بائبل کا ترجمہ شایع کرتے ہیں۔ مگر قرآن مجید کے تراجم ابتک شاید دو درجن سے زیادہ زبانوں میں نہیں ہوئے، اور ان میں بھی بیشتر حصہ عیسائیوں ہی کا ہے۔ عیسائیوں نے جتنے ترجمے شائع کئے ہیں سب مستند اور معتبر ہیں اور ان کی صحت کا اطمینان کرنے کی پوری کوشش کی گئی ہے۔ مگر یہاں اردو اور فارسی کے سوا کسی زبان میں بھی کوئی قابل اطمینان ترجمہ نہیں ہوسکا ہے۔ عیسائیوں نے ان زبانوں تک میں ترجمے کر ڈالے ہیں جن کے بولنے والے ہزاروں سے زیادہ نہیں ہیں۔ مگر ہم نے ابھی تک ان زبانوں میں بھی قرآن کا ترجمہ نہیں کیا جن کے بولنے والے کروڑوں ہیں۔ حد یہ ہے کہ ہم نے آج تک انگریزی زبان میں بھی کوئی صحیح اور معتبر ترجمہ شایع نہیں کیا، حالانکہ ہمارے پاس اس کے ذرائع کا فقدان نہیں ہے، اور اغیار تو درکنار خود ہماری اپنی ملت کے ہزاروں تعلیمیافتہ اشخاص اس ترجمے کے حاجتمند ہیں۔ عیسائیوں نے وحشی زبانوں تک کو خاص بائبل کے ترجمے کے لئے ادبی اور تعلیمی زبان بنا دیا۔ مگر ہم نے ان زبانوں کو بھی قرآن کے علم سے بہرہ مند نہ کیا جو پہلے سے ادبی اور تعلیمی زبانیں ہیں۔ اس تفاوت عظیم کے باوجود اگر آج اسلام مسیحیت کا کامیاب مقابلہ کر رہا ہے اور اکثر میدانوں میں اسے شکست دے رہا ہے تو یہ صرف اس لئے ہے کہ اسلام کو مسیحیت پر بالذات فوقیت حاصل ہے۔ رہے مسلمان اور مسیحی تو اس میں کوئی شک نہیں کہ خدمت دین کے لحاظ مسیحی مسلمان کے مقابلہ میں ہزار درجہ بلکہ لاکھ درجہ زیادہ بڑھا ہوا ہے۔

تفسیر سورۃ التین

از

مولوی اکرم علی صاحب محمدی

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۔ وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ ۔ وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ ۔ وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ ۔ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ۔ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ ۔ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ۔ فَمَا يُكَذِّبُكَ بَعْدُ بِالدِّيْنِ ۔ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَحْكَمِ الْحٰكِمِيْنَ ۔

اس سورۂ شریف کی ابتدا میں و قسمیہ ہے۔ قسم کے متعلق عام خیال یہ ہے کہ جس چیز کی قسم کھائی جاتی ہے وہ شریف و بزرگ اور جلیل المرتبت ہونی چاہئے اس بنا پر اعتراض وارد ہوتا ہے کہ تین اور زیتون میں کونسا شرف ہے؟ اور اگر شرف ہو بھی تو باری تعالیٰ کا مرتبہ اس سے بلند تر ہے کہ وہ کسی چیز کی قسم کھائے۔ دوسرا خیال یہ ہے کہ قسم اس وقت کھائی جاتی ہے جب کسی بات کا یقین دلانا مقصود ہو۔ اس بنا پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ جو شخص کسی بات کا منکر ہو اس کے سامنے قسم کھانا کچھ مفید نہیں اس کو تو دلیل و برہان سے قائل کیا جا سکتا ہے نہ کہ قسم سے۔

علامہ ابن قیم نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ قرآن مجید میں جتنی قسمیں کھائی گئی ہیں وہ یا تو خود اللہ تعالیٰ اور اس کی صفات کی قسمیں ہیں یا اگر مخلوقات کی ہیں تو اس حیثیت سے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی قدرتوں اور ربوبیت کی نشانیاں ہیں۔ اس سے پہلا شبہ دور کرنا مقصود ہے۔ دوسرے شبہ کو وہ اس طرح دور کرتے ہیں کہ جن چیزوں کی قسمیں کھائی گئی ہیں وہ خود مقسم علیہ یعنی اللہ کی ذات اور اس کی آیات اور دیگر امور ایمانیہ مثلاً معاد وغیرہ پر دلالت کرتی ہیں۔ امام رازی نے پہلے شبہ کو دور کرنے کے لئے۔ ان چیزوں کا شرف ثابت کرنے

کی کوشش کی ہے جن کی قسمیں قرآن مجید میں کھائی گئی ہیں۔ اور دوسرے شبہ کو وہ یہ کہکر دور کرتے ہیں کہ قسم دراصل مخاطب کو متنبہ کرنے کے لئے کھائی جاتی ہے تاکہ وہ قسم کا لفظ سن کر متوجہ ہوجائے اور سمجھ لے کہ اب جو کچھ کہا جانے والا ہے وہ کوئی بڑی بات ہے۔

لیکن علامہ حمید الدین فراہی رحمہ اللہ نے اپنے رسالہ امعان فی اقسام القرآن میں ثابت کیا ہے کہ قسم کا مقصود استشہاد ہے۔ شرف اور بزرگی سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں کی قسم کھائی ہے وہ دراصل ان امور کی صداقت پر گواہی دیتی ہیں جو قسم کے بعد بیان کئے گئے ہیں۔ یہ اقسام قرآن کی بہترین تاویل ہے جو کی گئی ہے۔ اور اس تاویل کی رو سے پہلی آیت کے معنی یہ ہونگے کہ تین اور زیتون اور طور سینین اور بلد امین گواہ ہیں۔ اس بات پر جو آگے بیان کی جانے والی ہے۔

تین اور زیتون کے معروف معنی انجیر اور زیتون نامی پھلوں کے ہیں۔ ایک گروہ جس میں عکرمہ مجاہد حسن، ابراہیم اور کلبی رحمہم اللہ شامل ہیں، اس طرف گیا ہے کہ آیت مذکور میں تین سے مراد وہی انجیر ہے جس کو ہم کھاتے ہیں اور زیتون سے مراد وہی چیز ہے جس کا ہم تیل نکالتے ہیں۔ ابن جریر طبری، امام رازی اور قاضی بیضاوی وغیرہم نے بھی اسی کی تائید کی ہے۔ ایک دوسرا گروہ کہتا ہے کہ تین سے مراد مسجد دمشق اور زیتون سے مراد بیت المقدس ہے۔ کعب اور قتادہ اور ابن زید رحمہم اللہ اسی کے قائل ہیں۔ ایک تیسرا گروہ تین کے متعلق کہتا ہے کہ اس سے مراد مسجد نوح علیہ السلام ہے جو کوہ جودی پر تھی اور زیتون سے مراد بیت المقدس ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہی قول منقول ہے جن لوگوں نے تین اور زیتون سے معنی معروف مراد لیے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ان دونوں پھلوں کو ان کے فوائد کے لحاظ سے قسم کے لئے انتخاب کیا گیا ہے۔ مگر یہ تاویل تکلف سے خالی نہیں ہے۔ اور تکلف کے باوجود طور سینین اور بلد امین سے معنوی ربط قائم نہیں ہوتا۔ البتہ اگر تین سے مراد منابت تین اور زیتون سے مراد منابت زیتون لئے جائیں تو ایک طرح سے ربط قائم ہوجاتا ہے لیکن طور سینین اور بلد امین کی جس خصوصیت کا لحاظ کرکے ان کی قسم کھائی گئی ہے۔ اس کی رعایت اگر ملحوظ رکھی جائے تو زیادہ بہتر تاویل یہی نظر آتی ہے کہ تین سے مراد

جودی اور زیتون سے مراد بیت المقدس لئے جائیں کیونکہ ان دونوں کو دو بڑے جلیل القدر پیغمبروں (نوحؑ اور عیسیٰؑ علیہما السلام) کے ساتھ نسبت ہے' اور انہی دونوں کا ذکر تورات میں "سعیر" اور "قدس" کے نام سے کیا گیا ہے۔ (۲:۴۳)

طورِ سینین سے مراد بعض لوگوں نے محض ایسا پہاڑ لیا ہے جس پر درخت ہوں۔ وہ کہتے ہیں کہ طور ہر پہاڑ کو کہتے ہیں اور سینین حبشی زبان میں خوش منظر کے معنی میں آتا ہے۔ عکرمہ مجاہد اور کلبی نے یہی معنی اختیار کئے ہیں لیکن ابن عباسؓ ابن زید، کعبؒ قتادہ اور حسن کہتے ہیں کہ اس سے موسیٰ بن عمران علیہ السلام والا پہاڑ مراد ہے۔ یہی تاویل زیادہ صحیح ہے اور توراۃ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ پروردگار سینا سے آیا (۲:۳۳)

لبد امین سے مراد بالاتفاق مکہ معظمہ ہے جس کے متعلق حضرت ابراہیم نے دعا فرمائی تھی کہ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا' اور جس کے متعلق خود حق تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اَوَلَمْ یَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا۔ اور جس کے متعلق توراۃ میں آیا ہے کہ خدا فاران سے روشن ہوا (۲:۳۳)۔

پس آیۃ مذکورہ کا ترجمہ یہ ہوا کہ جودی جس پر نوحؑ نے خدا کو یاد کیا' اور بیت المقدس جہاں عیسیٰؑ نے اپنے رب کی تقدیس کی اور طور جہاں موسیٰ سے خدا نے کلام کیا اور بلد امین جہاں ابراہیم و اسمٰعیل اور محمد علیہم السلام نے شمع حق جلائی' اس بات پر گواہ ہیں۔

وہ بات کیا ہے جس پر یہ چار عظیم الشان تاریخی مقامات گواہی دے رہے ہیں؟ وہ یہ ہے کہ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ۔ ہم نے انسان کو بہترین ساخت' بہترین صورت' نہایت معتدل ترکیب کا بنایا اور اس کی خلقت کو ایسا استوار کیا کہ کوئی اور مخلوق اس معاملہ میں اس کے برابر نہ ہوئی۔ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ۔ پھر ہم نے اس بہترین خلقت کے باوجود اس کو مخلوقات کے نیچے سے نیچے درجہ میں پھینک دیا۔ کیوں؟ اس کا جواب بعد کے فقرہ سے مل جاتا ہے۔ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَیْرُ مَمْنُوْنٍ۔ مگر اس ذلیل ترین درجہ میں گرنے سے وہ لوگ بچ گئے جنہوں نے ایمان کے ساتھ عمل صالح کئے۔ معلوم ہوا کہ جو لوگ مخلوقات کے سب سے نیچے درجہ میں پھینکے گئے ان کا

یہ انجام اس لئے ہوا کہ انہوں نے اپنے رب کو نہ پہچانا، اور ایمان و عمل صالح سے اعراض کیا۔ دوسری مخلوقات تو انسان سے اسی لئے فروتر نہیں کہ ان کو وہ قوت ہی نہ دی گئی تھی جس سے وہ اپنے رب کو پہچانتیں اور علی وجہ البصیرت اس کی عبادت کرتیں۔ وہ اللہ جل و عز کی تقدیس و تسبیح محض اس بنا پر کرتی تھیں کہ ان کی جبلت ایسی ہی بنائی گئی تھی۔ مگر جب انسان نے معرفت حق کی قابلیت رکھنے کے باوجود اس کا غلط استعمال کیا اور تمام مخلوقات سے بہتر ہونے کے باوجود خدائے بزرگ و برتر کو چھوڑ کر اپنے سے فروتر مخلوقات کو معبود بنایا، پتھروں کے سامنے جھکا، درختوں کی تعظیم کی، جانوروں کو پوجا، دریاؤں کی تقدیس کی، تاروں کا پرستار بنا، روحانی اور خیالی ہستیوں کی عبادت میں مشغول ہوگیا؛ اور ہر اس قوت کے سامنے سر نیاز خم کرنے لگا جو اس کی خدمت کیلئے مسخر کی گئی تھی، تو وہ ان سب چیزوں سے زیادہ ذلیل کردیا گیا جن پر اسے احسن تقویم میں ہونے کے سبب سے فوقیت و برتری حاصل تھی۔ یہی کوہ جودی ہے جس نے اس کو غرق ہوتے اور اس کی مایۂ ناز تہذیب کو اس کے سرمایۂ فخر آلات و ادوات زینت تباہ ہوتے دیکھا ہے۔ یہی بیت المقدس ہے جس نے اس کو بابل و ایران اور روم و یونان کی فوجوں سے پامال ہوتے، اور ہمیشہ کے لئے ذلت و مسکنت میں مبتلا ہوتے دیکھا ہے۔ یہی طور سینین ہے جس نے اس کی ایک سرکش قوم کو غرقاب ہوتے دیکھا ہے۔ یہی بلد امین ہے جس کے گرد وہ صدیوں تک جانوروں کی سی زندگی بسر کرتا رہا ہے۔ بخلاف اس کے یہی انسان ہے کہ جب وہ ایمان کے نور سے بہرہ ور ہوا اور نیکی کے راستوں پر چلا تو اس کو وہ رفعتیں نصیب ہوئیں جن پر نوح کا جودی اور موسیٰ کا طور، اور عیسیٰ کا بیت المقدس اور ابراہیم و آل ابراہیم کا بلد امین گواہی دے رہا ہے۔ اس کو برکت اور سلامتی کا مژدہ سنایا گیا، اس کو خدا سے ہم کلامی کا شرف بخشا گیا، اسے تمام جہان کی امامت سے سرفراز کیا گیا۔ اس کو وہ معراج نصیب ہوئی جو کسی کے حصہ میں نہ آئی تھی، اسے وہ اجر دیا گیا جو بے حساب اور غیر منقطع ہے۔ دنیا میں بھی اس کا بول بالا ہوا۔ اس کو عزت نصیب ہوئی اس کا نام چمکا۔ اسی کے دین کا سکہ چلا۔ اسی کی خاک پا کو کروڑوں انسانوں نے عقیدت کے ساتھ سرمۂ چشم بنایا۔ اور آخرت میں بھی وہی اپنے رب کے تقرب، اور اپنے مالک کے جمال کی دید سے بہرہ مند اور غیر فانی نعمتوں

اور لذتوں سے فیض یاب ہوگا۔

مگر یہ کس چیز کا صلہ ہے؟ صرف ایمان کا نہیں۔ صرف عمل صالح کا نہیں۔ ایمان اور عمل صالح دونوں کا۔ اسفل سافلین میں گرنے سے صرف وہی لوگ مستثنی کئے گئے ہیں۔ جو ایمان بھی لائے اور جنہوں نے عمل صالح بھی کئے۔ ایمان بلا عمل ایک روح ہے بے قالب۔ اور عمل بلا ایمان ایک قالب ہے بے روح۔ جس طرح زندگی کے آثار اور احکام روح اور قالب دونوں کے مجموعہ پر مترتب ہوتے ہیں۔ نہ کہ کسی ایک پر، اسی طرح اجر غیر ممنون بھی ایمان اور عمل صالح دونوں کے مجموعہ پر ہی مترتب ہوسکتا ہے نہ کہ کسی ایک پر۔

پھر فرمایا فَمَا يُكَذِّبُكَ بَعْدُ بِالدِّينِ ۔ أَلَيْسَ اللَّهُ بِأَحْكَمِ الْحَاكِمِينَ ۔ یعنی اے انسان کفر و نافرمانی کے یہ نتائج، اور ایمان و عمل صالح کے یہ ثمرات اپنی آنکھوں سے دیکھ لینے کے بعد اب کیا چیز ہے جو تجھکو دین کے جھٹلانے پر آمادہ کرتی ہے؟ کیا چیز ہے جس نے تجھے اللہ کی اطاعت سے منہ موڑنے پر اکسایا ہے؟ کس چیز سے دھوکہ کھاکر تو سمجھ رہا ہے کہ تیرے کردار کا کبھی حساب نہ لیا جائے گا۔ اور تجھے اپنے دل اور ہاتھوں کی کمائی کا انجام نہ دیکھنا پڑے گا؟ کیا یہ سب کچھ دیکھ کر بھی تجھے معلوم نہ ہوا کہ خدا سب حاکموں کا حاکم ہے؟

نمونہ کا پرچہ مفت منگائیے

قاسم العلوم رمضان المبارک ۱۳۵۲ھ سے نہایت پابندی وقت کے ساتھ جاری ہے۔ اکابر علماء دیوبند کے علمی فیوض و برکات کا مرقع جس میں ہر قسم کے علمی مذہبی مضامین عالیہ شایع ہوتے ہیں حضرت حکیم الامۃ مولنا شاہ اشرف علی صاحب مدفیوضہم کے مستقل مضامین عالیہ کے علاوہ حضرت قاسم العلوم و الخیرات بانی دارالعلوم و دیگر اکابرین امت کے نادر و نایاب و غیر مطبوعہ مضامین آپ کو صرف قاسم العلوم ہی میں ملیں گے ہر مسلسل مضمون کے ختم پر اس کی مستقل کتاب آسانی سے مرتب ہوسکتی ہے رسالہ قاسم العلوم ہندوستان کا واحد لاثانی رسالہ ہے جس کا مطالعہ مسلمانوں کے ہر طبقہ کے لئے از حد مفید ہے۔ قیمت سالانہ۔ معاونین خاص عالم مسلمانوں سے ۸ عام ۶ طلبا مدارس عربیہ سے مرفوعہ ۴۔ پتہ عملہ مرا سلات کا۔ احقر عتیق احمد صدیقی مدیر الانصار دارالعلوم دیوبند۔ (یوپی)

پاپُولر

(از جناب چوہدری غلام احمد صاحب پرویز بی اے ہوم ڈیپارٹمنٹ شملہ)

ہر زمانہ میں ہر ایک سوسائٹی میں عام طور پر کچھ الفاظ ایسے مروج و متداول ہوتے ہیں جن کا اطلاق بالعموم اس سوسائٹی کے اعلیٰ ترین اخلاق و محاسن کا آئینہ دار ہوتا ہے اور ان کا انتساب کسی فرد و احد کے مکارم اخلاق کی معراج کمال کا کفیل یعنی وہ الفاظ ایسے مقیاس الحرارت (تھرمامیٹر) ہوتے ہیں کہ ان سے اجتماعی و انفرادی نبضِ اخلاق کا صحیح صحیح درجہ معلوم ہو جاتا ہے پہلے دنوں میں، اسلامی سوسائٹی میں امین۔ صدیق۔ مجاہد۔ مومن۔ متقی۔ متشرع۔ پرہیزگار۔ متدین۔ دیانتدار۔ اور ایسے ہی بہت سے الفاظ مروج تھے کہ اِدھر متکلم کی زبان سے ادا ہوئے اور اُدھر مخاطب کے ذہن میں ان کے منسوب الیہ کی سچی سچی تصویر مرتسم ہو گئی۔ مگر آج ہماری اینگلو مسلم سوسائٹی[۱] میں یہ الفاظ تو قدامت پسندی۔ دقیانوسیت۔ مُلّائیت پر محمول کئے جاتے ہیں۔ البتہ انکی جگہ ایک جامع لفظ انگلستان سے لیا گیا ہے جس کا انتساب ہزار عزت و افتخار کا موجب اور جملہ اخلاق جمیلہ کا ماحصل ہوتا ہے یعنی جس کسی کی انتہائی تعریف مقصود ہو، اس کے متعلق اتنا کہدینا کافی ہے کہ وہ بہت پاپولر ہے۔ یہ وہ اعزاز ہے جس کا حصول آج عین مقصد حیات قرار پا رہا ہے۔ اور جس کے لئے ہر قربانی "جہاد فی سبیل اللہ" کا درجہ رکھتی ہے یوں تو اس کے معنی محض "ہر دلعزیز" ہیں لیکن روشن خیال طبقہ کی اس ہر دلعزیزی کے عناصر ترکیبی اس ہر دلعزیزی سے کہیں مختلف ہیں جو کبھی قدامت پسندوں کے "دورِ جہالت" میں رائج تھے۔

مثلاً کسی صاحب سے آپکو اس قدر دلی نفرت ہو کہ آپ اس کی صورت دیکھنے کے روادار نہیں۔ کہیں تنہائی میں اس کا خیال آجاتا ہے تو اس کی تخریب و تذلیل کے لئے ہر ممکن تدبیر سوچی جاتی ہے، اس کے عادات

[۱] اس سے مراد وہ تہذیب جدید ہے جو اسلامی جسد اور مغربی روح کے امتزاج و اتصالات سے پیدا کی جا رہی ہے۔ منہ

خصائل۔ رنگ ڈھنگ، انداز و اطوار، غرض اس کی ہر ادا آپ کے نزدیک مکروہ و مبغوض ہے۔ وہی شخص راہ چلتے ہوئے اتفاقیہ سامنے آجاتا ہے خوشی سے آپ کی باچھیں کھل جاتی ہیں۔ دور سے ہی مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھ جاتا ہے "ہیلو مسٹر" کی غلغلہ انداز آواز فضا میں مسرت خیز لہریں پیدا کر دیتی ہے۔ ہاتھ اس کشش و جاذبیت سے ملایا جاتا ہے کہ "سوزِ محبت" گھنٹوں تک مغز استخواں میں حرارت پیدا کئے رکھتا ہے۔ بڑے تپاک کی باتیں۔ بڑی محبت کی گفتگو۔ کہیں نہ ملنے کے گلہ ہائے دراز کہیں تغافل بیجا کی شکایت ہائے رنگیں کبھی اظہار مسرت کہ امتحان میں بڑی نمایاں کامیابی حاصل کی کبھی ایمائے خوف و اندیشہ کہ محنتِ شاقہ سے صحت پر برا اثر پڑا ہے عود صحت کے لئے دوائیں آیندہ ترقیوں کے لئے دعائیں۔ تبریک و تہنیت کا خط نہ لکھ سکنے کی معذرت۔ محفلِ احباب میں شرکت کی دعوت غرض کہ غالب مرحوم نے جہاں تمام دعائیں صرف دربان کر دی تھیں آپ نے بھی تمام اداییں صرف مہربان کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ اور قلت وقت کے عذر۔ اور آیندہ سلسلہ ملاقات جاری رکھنے کے وعدہ و وعید اور اصرار و تکرار پر رخصت ہوئے۔ اس نے منہ ادھر موڑا اور ادھر یاران نکتہ داں میں ایک قہقہہ بلند ہوا کہ یا عجب بنایا۔ کہنے لگے کہ میاں، پاپولر ہونے کی سکیم اسی طرح کامیاب ہوا کرتی ہے۔

ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔ سمجھ لیجئے کہ یہ صاحب ایک نہ ایک دن پاپولر ہو کے رہیں گے۔

یا مثلاً آپ کہیں باہر جانے کی تیاری میں ہیں کہ ادھر سے نوکر ایک ملاقاتی کارڈ ہاتھ میں دے دیتا ہے۔ کارڈ دیکھ کر سب سے پہلے آپکا ہاتھ ماتھے پر جاتا ہے اور سب سے پہلا سوال نوکر سے یہ ہوتا ہے کہ تم نے کیا جواب دیا ہے۔ یہ تو نہیں کہہ دیا کہ صاحب گھر میں ہی ہیں"۔ اگر ملازم کہیں نیا نیا ہی آیا ہے۔ یا ملنے والے صاحب ہی گھر کے بھیدی" واقع ہوئے ہیں تو یہ اطلاع ان تک پہنچ چکی ہوتی ہے کہ صاحب گھر میں ہی ہیں۔ اس جرم کی پاداش میں نوکر پر جو قیامت ٹوٹنے والی ہے اس کا وقت تو ذرا ٹھیر کر آئیگا۔ سب سے پہلے ملاقات کے کمرے میں تشریف لائیے آدھا جلا ہوا سگار پھر سے جلایا۔ (تاکہ ظاہر ہو کہ ایک عرصے سے یہیں بیٹھے ہیں) حکیم این سٹائن کے نظریہ اضافیت کی کتاب سامنے رکھ لی (جسے تمام دنیا میں اب تک معدودے چند اشخاص ہی سمجھ سکے ہیں)۔ اور جذب و انہماک کی

انتہائی گہرائیوں میں آواز دی کہ ہاں بلا لاؤ۔

"اُٹھا آپ کدھر سے نکل آئے۔ ارے میاں اب تم ہم لوگوں سے ملتے ہو بھلا۔ سپرنٹنڈنٹ ہاتھوں میں افسر خوش اور اب چاہئے کیا" (معراج زندگی ملاحظہ ہو)۔

"میں مسٹر جوزف[1] (یہ اس محمد یوسف کا تفرنجی ہے جو ان کے والد بزرگوار نے اسلام سے کچھ نسبت پیدا کرنے کے لئے رکھ دیا تھا) لوگوں کے ساتھ تعلقات خواہ کسی نوعیت کے ہوں لیکن جو قلبی واسطہ تمہارے ساتھ ہے وہ کبھی کم ہو سکتا ہے؟ ہاں تو میں کیا تمہاری مصروفیتوں میں ہارج تو نہیں ہوا۔

شکریہ نہیں بھائی صبح سے بیٹھا بیٹھا اکتا گیا تھا۔ جی میں ہی تھا کہ کوئی ادھر آنکلے تو تنہائی رفع ہو۔ تم تو پیغام رحمت ہو۔ اور ہاں۔ یار۔ چائے پیو گے" (حالانکہ دس ہی منٹ پیشتر انہیں خود چائے مانگنے پر جواب ملا تھا گھر میں دودھ نہیں)۔

"نہیں تکلف کی ضرورت نہیں۔ اپنا گھر ہے۔ میں ابھی ابھی چائے پی کے آ رہا ہوں" (خواہ صبح سے مارے مارے پھر رہے ہوں۔ اور پیٹ میں چوہے ناچ رہے ہوں)۔" اور ہاں ان صاحب سے ملئے میرے عزیز ترین دوست مسٹر اے۔ کے۔ ناز۔"

"آپ سے ملکر بے حد خوشی ہوئی" (یعنی جس کے متعلق نہ کچھ جانتے ہیں نہ پوچھتے ہیں۔ اور دونوں وبال جان نووارد ہو رہے ہیں۔ اس سے ملکر بے حد خوشی ہوئی)۔

"بھائی تم سے تصنع برتنے کی کیا ضرورت۔ اس وقت آنے سے غرض یہ ہے کہ مسٹر ناز ۔ ۔ ۔ ۔ سوسائٹی کی سکرٹری شپ کے لئے بطور امیدوار کھڑے ہو رہے ہیں۔ آپ اس کے ممبر ہیں۔ آپ کا ووٹ چاہئے۔ اور میں لیکر جاؤنگا" یہ کہے جا رہے ہیں (اور بالکل غلط) کہ صاحب میں نے ابھی صبح ہی مسٹر ۔ ۔ ۔ سے وعدہ کر لیا ہے آپ پہلے تشریف لے آتے تو کیا ہی اچھا تھا۔ وغیرہ وغیرہ مگر ادھر سے اصرار پہ اصرار چلا جا رہا ہے۔ اور ان کی بھی مروت کا تقاضا ہے کہ "روکھا جواب" نہ دیں۔ بالآخر یہ طے ہوا کہ اچھا صاحب میں آپ کو ہی ووٹ دونگا مطمئن رہئے۔

[1] اس تمام مضمون میں روئے سخن کسی شخص کی جانب نہیں بلکہ عام حالت کا بیان مقصود ہے۔ مدیر

جب آپ کہتے ہیں کہ ان حضرت سے بہتر اور کوئی شخص اس عہدہ کے لئے موزوں نہیں تو صبح کا زبردستی وعدہ لیا ہوا اس کے مقابلہ میں کیا وقعت رکھتا ہے"۔

مزید توثیق و تصدیق کے بعد وہ رخصت ہوئے۔ اور جاتے ہوئے کہہ گئے کہ صاحب بھولنا نہیں۔ اور اپنے حلقہ احباب میں بھی ذرا انکا پروپیگنڈا کرنا۔ انہوں نے بڑی خوشی سے گردن ہلادی۔

شام کے وقت فریق مخالف کے صاحب آن دھمکے اور راسی اصرار و تکرار۔ عذر و معذرت کے اعادہ کے بعد ان سے بھی وعدہ کرلیا کہ اچھا صاحب ووٹ آپکا۔

تاریخ انتخاب کی صبح سے ہی جو آپ غائب ہوئے ہیں۔ رات تک واپس نہیں آئے۔ دوسرے دن ناکام امیدوار سے معذرت چاہی کہ "اچانک ایک دوست کا ٹیلی گرام آگیا جس کی وجہ سے مجھے باہر جانا پڑگیا میں نے تو کوشش بہت کی لیکن خیر پھر سہی"۔ کامیاب امیدوار سے جوش مسرت میں معذرت کی بھی ضرورت نہ سمجھی۔ کہ ممکن ہے اُسے یاد ہی نہ ہو کہ یہ واپس آئے بھی تھے یا نہیں۔ اور کہدیا کہ استاد میں ووٹ میرے فراہم کردہ تھے"۔

سمجھ لیجئے کہ ایک دن یہ صاحب یقیناً تمام سوسائٹی میں پاپولر ہوں گے

یا مثلاً کھانے کی میز پر احباب کا جمگھٹا ہے مختلف مذاہب (باعتبار پیدائش) کے لوگ بیٹھے ہیں مذہب نے نوع انسانی کو جس ذلت و خواری کی پستیوں میں ڈھکیل رکھا ہے اس کے خلاف اظہار نفرت کیا جارہا ہے۔ اب آپکے پاپولر ہونیکی اسکیم کے لئے ضروری ہے کہ آپ بھی ان کی ہاں میں ہاں ملائیے۔ چنانچہ "ملاازم" کے تشابہات سے خدا اور رسول کے محکمات تک سب کے سب اس استہزار و تمسخر کی لپیٹ میں بہے چلے جارہے ہیں قہقہوں پر قہقہے اڑ رہے ہیں۔ اور ان کے ساتھ ہی تمام "پارینہ خیالات" کی دھجیاں فضا میں اڑتی جاتی ہیں۔

اس حریت فکر اور "آزادی خیال" کا ہیرو بھی ایک نہ ایک دن پاپولر ہو کے رہیگا۔

یا مثلاً۔ ایک واقعہ کے متعلق گفتگو ہو رہی ہے۔ کوئی غلط کہتا ہے کوئی صحیح۔ آپ کو اس کا حتمی طور پر علم ہے

لیکن چونکہ اس یقینی علم کے اظہار سے کسی کبیر کی تغلیط ضروری ہے۔ اس لئے ہر دلعزیزی کی سکیم کا تقاضا ہے کہ حقیقت پوشی سے کام لیں جب آپ سے پوچھا بھی جائے تو صاف کہدیں کہ "نا بھئی مجھے اس کے متعلق کچھ علم نہیں۔"

یہی نہیں آپ کے سامنے ایک حقدار کا حق دوسرا شخص غصب کئے جارہا ہے، عینی شہادت آپ کی ہی ہے آپ سے پوچھا جاتا ہے پاپولر ہونے کی اسکیم کے لئے ضروری ہے کہ آپ کہدیں کہ نہیں صاحب مجھے یاد نہیں پڑتا کہ اصل واقعہ کیا تھا۔ میں اخبار بینی میں ایسا محو تھا کہ کچھ سنا ہی نہیں۔"

یا یہ کہ کسی کی غیبت میں اس کی ذات کے خلاف بدترین اتہام لگائے جائیں لیکن جب اس کے سامنے ذکر آئے تو صاف صاف مکر جائیں۔ اس سے آپ تو معتبر کے معتبر رہیں گے اور آپ کے بیان کے شاہد خود بخود دروغ باف اور فتنہ پرداز قرار پا جائیں گے۔

یا مثلاً ایک شخص کے متعلق آپ کو خوب علم ہے کہ بیحد تنفسی بڑا بد فطرت۔ دروغ گو حاسد اور خود پسند ہے۔ خوشامد پسندوں کے طفیل پبلک کی کوئی امانت اس کے سپرد کئے جانے کی تجویز ہے۔ جس کا وہ ہرگز اہل نہیں۔ وہ از راہ کسر نفسی (جسے فی الحقیقت کبر نفسی کہنا چاہئے) کہہ رہا ہے کہ نہیں صاحب میں تو اس کا اہل نہیں ہوں۔ پاپولر ہونے کی سکیم کے لئے ضروری ہے کہ آپ فوراً پکار اٹھیں۔ کہ "واہ صاحب اس قدر کسر نفسی۔ خدا کی قسم اس قحط الرجال میں آپکا وجود گرامی ہمارے لئے از بس مغتنم ہے۔ آپ کو کیا علم کہ آپ کس قدر مبارک ہستی ہیں۔ بھائی! اپنے لئے نہیں تو محض خدا کا کام سمجھ کر اسے سنبھالئے۔ آپ سے زیادہ اس کا کوئی اور اہل نہیں۔"

یا کوئی صاحب گپ ہانک رہے ہیں۔ ہر دلعزیز بننے کی اسکیم کا تقاضا ہے کہ اسے ٹوکئے نہیں لوگوں کے سامنے ہی نہیں بلکہ تنہائی میں بھی اسے اس کی کذب بیانی یا کسی ایسے ہی اور عیب پر تنبیہ نہ کیجئے کیونکہ اس سے وہ برا مانے گا۔ اور آپ پاپولر نہیں رہ سکیں گے۔

غرض کہ یہ چند اصول ہیں جن پر کاربند ہونے سے پاپولر ہونے کی سکیم کا کامیاب ہونا یقینی ہے ان کے علاوہ بہت سے فروع بھی ہیں جن کی تفصیل طول طویل ہو گی منجملہ ان کے۔ اپنی تنخواہ کو اصل سے

ہمیشہ تین گنا بتانا۔ اپنے آباو اجداد کو کسی نہ کسی نواب صاحب کے خاندان سے منسوب کرنا یہ بھی ضروری ہے کہ بیوی کا (اگر وہ پردہ میں ہے تو) خواہ پاجامہ پھٹ رہا ہو مگر صاحب کی پتلون کی سلوٹ نہ خراب ہو جائے۔ بچے کے لکھنے کی تختی نہ آئے لیکن ٹینس کا ریکٹ ضرور والد ماجد کی بغل میں ہونا چاہئے کہ اس سے کسی بڑے آدمی کے ٹینس کورٹ تک رسائی ہو سکتی ہے۔ مہینے کی آخری تاریخوں میں خواہ آٹا ادھار لے کر کھانا پڑے لیکن سینما جانا کبھی ناغہ نہ ہو۔ بیوی بچے خواہ گھر کے اندر باسی روٹیوں پر گذران کر رہے ہوں لیکن آپ کے ٹفن میں جو لوگوں کے سامنے جائے، مرغ مسلم نہیں تو کم از کم مرغ پلاؤ تو ضرور ہو۔ علاوہ بریں مہینے میں ایک آدھ دعوت بھی ضرور دیں اور کھانے والے یہ کہکر کھا جائیں کہ خوب الو بنایا (اور اس کا آپ کو خوب علم ہو۔ کیونکہ جب آپ کسی کے ہاں کھانے پر گئے تھے تو یہی فقرہ اس میزبان کی شان میں غائبانہ ارشاد ہوا تھا)

مختصراً یہ کہ اصول ہوں یا فروع نکتہ یہ پیش نظر رہے کہ جو کچھ آپ ہیں وہ ظاہر نہ ہونے پائیں اور جو ظاہر ہوں وہ حقیقت نہ ہو۔ جو محسوس کریں وہ کہیں نہیں۔ اور جو کہیں وہ محسوس نہ کر رہے ہوں۔ قلب اور زبان میں ہم آہنگی کبھی نہ ہو۔ اور اس روش کا نام پالیٹکس یا مصلحت رکھ لیں بس پاپولر ہونے کی اسکیم کا کامیاب ہونا یقینی۔ اور یہ آخری ڈگری ہے جو آج اخلاقی یونیورسٹی سے آپ کو مل سکتی ہے۔

لیکن اگر یہ صحیح ہے کہ محض نام بدل دینے سے حقائق نہیں بدل جایا کرتے تو آئیے دیکھیں کہ قرآن کے دفتر سے اس اعزاز عظمیٰ کو کیا سند ملتی ہے قرآن کریم نے قول و فعل ظاہر و باطن قلب و زبان کی یکسانیت و ہم آہنگی کو ایک مسلم کا معیار خصوصی قرار دیا ہے۔ اور قول و فعل میں مغائرت اس کے نزدیک سب سے بری چیز ہے۔ ارشاد ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ — اے ایمان والو ایسی بات کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں۔

كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ — خدا کے نزدیک یہ بہت ناپسندیدہ ہے کہ تمہارا قول و فعل یکساں نہ ہو

(۶۱ : ۲)

اور منافقین کے متعلق فرمایا کہ۔

يَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِهِمْ مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يَكْتُمُوْنَ (۳ : ۱۷) وہ زبان سے وہ بات کہتے ہیں جو ان کے دل میں نہیں ہوتی اور اللہ خوب جانتا ہے جس چیز کو وہ دلیں چھپاتے ہیں

گویا اسلام اور حق وصدق مرادف الفاظ ہیں۔ استیعاب مقصود نہیں ورنہ تمام قرآن ان امثال لّ نظائر سے بھرا پڑا ہے جن میں اس ایمان اور اقرار کی قطعاً کوئی قیمت نہیں رکھی گئی جو حلق سے نیچے اتر کر قلب کے عمیق گوشوں میں جاگزین نہ ہو۔

اعلاء کلمۃ الحق کی اہمیت کے اظہار اور کتمانِ حقیقت کے خلاف کس قدر رہین الفاظ میں ارشاد ہے

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ ..... فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ۝ (۴ : ۲۰)۔ اے ایمان لانے والو تم انصاف پر قائم رہو اور خدا کی طرف سے (ہمیشہ) حق کے شاہد رہو خواہ یہ گواہی خود تمہارے اپنے نفس کے خلاف۔ یا والدین یا دیگر رشتہ داروں کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ وہ شخص (جس کے خلاف حق کی شہادت دینی پڑے) خواہ امیر ہو خواہ غریب۔ اللہ کو ان کے ساتھ یکساں تعلق ہے۔ تو تم خواہش نفس کی اتباع نہ کرو کہ (کہیں تم) حق و انصاف سے ہٹ جاؤ اور اگر تم کج بیانی کروگے تو بلاشبہ اللہ تمہارے سب اعمال کی پوری خبر رکھتا ہے۔

ان تین احکام کی موجودگی میں قرآن کو قرآن جاننے والے کے لئے کہاں یہ گنجایش رہتی ہے کہ ایک واقعہ اس کے سامنے پیش ہو۔ اور وہ اس کے متعلق غلط بیانی کرے۔ یا حق گوئی سے اعراض کرے اور خاموش رہے۔ وہ ایسے وقت میں اللہ کی بے نیام تلوار ہے جو ذاتی خواہشات اور رجحانات دنیوی کو بالائے طاق رکھکر حق و صداقت کے لئے پل نکلتی ہے خواہ اس کی زد خود اس کی اپنی گردن پر ہو۔ یا اپنے والدین یا عزیز و اقارب کی گردن پر امیر کی امارت اور غریب کی غربت اس کی حق گوئی کے

راستہ میں مانع نہیں ہو سکتی۔ اس لئے کہ وہ مخالفین میں سے کسی ایک پارٹی کی طرف سے بطور گواہ شہادت نہیں دے رہا ہے۔ بلکہ قرآن کہتا ہے کہ شُهَدَاءَ لِلّٰهِ یعنی وہ اللہ کی طرف سے گواہ بنا ہے۔ اس لئے کسی پارٹی کا خیال اسے جادۂ حق و صداقت سے کسطرح منحرف کر سکتا ہے۔ واضح رہے کہ شہادت سے محض وہ شہادت ہی مقصود نہیں جو عدالت کے کمرہ میں ہی دی جائے۔ کیونکہ اس کی کہیں تخصیص نہیں۔ بلکہ زندگی کے ہر شعبہ میں، دنیا کے کسی گوشہ میں جہاں کوئی واقعہ اس کے سامنے پیش ہو، بہ حیثیت مُسلم اس کا فرض ہے کہ حقیقت بیان کر دے اور نہ صرف یہ کہ کج بیانی سے ہی باز رہے بلکہ گواہی کے موقع پر خاموش رہنا بھی قرآن کے نزدیک قابل مواخذہ ہے۔ اگر خاموش نشینی گناہ است۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ (۲:۱۶) اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جس کے پاس خدا کی طرف سے کوئی گواہی ہو اور وہ اسے چھپائے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہم کیا دنیا بھر کے ٹھیکہ دار ہیں کہ لوگوں کو برائیوں سے روکتے پھریں[1] اور اُن کے اعمال حیات کا جائزہ لے کر احتساب کرتے رہیں۔ سو جو مسلمان ہیں وہ سن رکھیں کہ اوروں سے تو غرض نہیں، مسلمان تو یقیناً دنیا بھر کے ٹھیکہ دار ہیں۔ ایک مُسلم کی تخلیق کا مقصد اس کا امتیاز خصوصی ہی یہی ہے کہ وہ دنیا بھر میں جہاں کہیں برائی دیکھے اسے روکے اور اس کی جگہ بھلائی کا حکم دے۔ فرمایا کہ۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (۳:۱۲) تم بہترین امت ہو جسے لوگوں کی رہنمائی کے لئے نکالا گیا ہے تم اچھے کاموں کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو۔

المعروف اور المنکر پر الف۔ لام، استغراق کے لئے آیا ہے کہ بھلائی کی اشاعت اور برائی کی

---

[1] فریضۂ احتساب اور امر بالمعروف مستقل عنوان ہیں جو بڑی تفصیل چاہتے ہیں۔ انشاء اللہ العزیز اس موضوع پر مستقل طور پر علیحدہ لکھا جائے گا سردست ضمنی طور پر چند اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ منہ

روک تھام میں کسی خاص نوعیت۔ یا زمان و مکان کی تخصیص نہ ہو۔ یعنی ایک مسلم۔ اُس شہنشاہ حقیقی کا سپاہی ہے جو رب العالمین ہے اور اس کا فریضۂ حیات یہ ہے کہ جہاں تمرد و سرکشی دیکھے، اس کا احتساب کرے۔ جہاں کسی کو صراط مستقیم اور حق و صداقت سے ہٹتا ہوا پائے، فوراً اسے روک کر راہ راست پر لے آئے، اور یہی وہ امتیاز ہے جس کی بدولت یہ خَیْرَ اُمَّۃٍ ہے اور یہ فریضہ بھی ہر مسلم پر اسی طرح فرض ہے جس طرح نماز روزہ فرض ہے۔

لیکن آہ۔ آن قدح بشکست و آن ساقی نماند۔

آج "مصلحت بینی" اور "اقتضائے وقت" کا زمانہ ہے پرانے وقتوں کی یہ باتیں کون سنتا ہے۔

اعتراض کیا جاتا ہے کہ صاحب۔ یہ کہاں کی انسانیت ہے کہ خواہ مخواہ ساری دنیا کو دشمن بنا لیا جائے دل کو محبت کے لئے مخصوص کر دینا چاہئے۔ ہر اک سے پیار۔ ہر اک کی عزت۔ انکسار۔ درگذر۔ عفو، چشم پوشی، تسامح، پاس و لحاظ۔ مروت، تحسین۔ یہ وہ خوبیاں ہیں جو شرف انسانیت ہیں اور یہی اخلاق کا اعلیٰ ترین معیار۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ تعلیم بڑی خوش آیند اور بیحد مرغوب نظر آتی ہے۔ اور ان الفاظ میں وہ محبوبیت و جاذبیت ہے کہ ایک دفعہ تو انسان ضرور ریجھ جاتا ہے کہ بات تو بالکل ٹھیک ہے لیکن ذرا غور سے دیکھا جائے تو سوائے لفظی طلسم کے اس وعظ کے اندر اور کچھ حقیقت نہیں ملتی۔ سب سے پہلے تو معیار اخلاق کے ایسے مدعی سے خود اس کی زندگی کا تجربہ پوچھنا چاہئے کہ جو کچھ وہ کہہ رہا ہے واقعی ہر موقع پر اس پر عمل بھی ہو سکتا ہے؟ اس کے بعد ان مواعظ حسنہ کا خود تجزیہ کیجئے تو نظر آئے گا کہ ان صفات میں سے ہر ایک صفت ایک وقت میں خود ایک عیب بن جاتی ہے اور جو کچھ اس کی ضد ہوتا ہے وہ اس کی جگہ صواب ہو جاتا ہے مثلاً عفو و درگذر بڑی اچھی چیز ہے لیکن کن لوگوں سے؟ محض ان سے جو اپنے کئے پر پشیمان اور اپنی غلطیوں پر نادم ہوں لیکن وہی عفو و درگذر عادی مجرم

سے کرتے جائیے۔ دیکھئے دنیا کے نظام کا کیا حشر ہوتا ہے مظلوم سے محبت کے معنی یہی ہیں کہ ظالم سے نفرت کی جائے
نیکی کو اگر پسند کرو گے تو اس کی خاطر بدی کو برا کہنا ہی پڑے گا۔ بدکردار سے مروت برتنے کے معنی یہ ہیں کہ آپ
نیکوکار انسانوں پر دنیا تنگ کرتے جارہے ہیں غضب وظلم کی تحسین کے یہ معنی ہیں کہ آپ دنیا سے عدل وانصاف
کو برباد کرتے چلے جارہے ہیں۔ عاجزی وشرافت بڑی خوبی ہے لیکن شرط یہ ہے کہ غیرت وخودداری ہاتھ سے نہ جائے
خاکساری اور انکسار بڑی نیکی ہے بشرطیکہ اس سے شریر و مفسد شیاطین کے حوصلے نہ بڑھتے جائیں کسی بے کس کو
پناہ دیجئے تو حسن اخلاق لیکن کسی مفرور مجرم کو پناہ دیجئے تو آپ بھی برابر کے مجرم کسی معصوم و بے گناہ کے ایک چھڑی
مار دیجئے تو دونوں جہانوں میں مستوجب عقوبت لیکن بے گناہوں پر حملہ آور کے سینے میں سنگین گھونپ دیجئے تو بقائے
دوام کا سہرا آپکے سر قتل وخونریزی دنیا کے عظیم ترین گناہوں میں سے ہے لیکن جب کوئی مجسٹریٹ حقیقی قاتل کے
خلاف فتویٰ موت صادر کرتا ہے تو منصف وعادل کا لقب پاتا ہے۔ غرض اس اصول کو جہاں تک پھیلاتے جائیے
نظر آتا جائے گا۔ کہ ایک محبت کے لئے ایک بغض۔ ایک عفو کے لئے ایک انتقام۔ ایک کی مدد کے لئے دوسرے کی
دشمنی۔ ایک تعمیر کے لئے ایک تخریب، لازمی اور ضروری ہے۔ جہاں محض انتقام وسخت گیری کوئی اخلاق نہیں ہاں
محض عفو و درگذر بھی کوئی خوبی نہیں بلکہ دونوں اپنی اپنی جگہ ضروری ہیں۔ ان دونوں کی حدبندی اور
ان کا جائز استعمال ہی عین اخلاق ہے۔ اور یہی وہ حدبندی ہے جسے اسلام نے صراط مستقیم، جادۂ اعتدال اور
دین فطرت قرار دیا ہے۔ اور اس پر عمل پیرا ہونے والوں کے لئے فرمایا ہے کہ

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا	اور اسی طرح ہمنے تم کو درمیانی اور وسط کی امت بنایا
شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ	تاکہ اور لوگوں کے (اعمال کے) تم گواہ بنو۔ اور تم پر رسول
عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا۔ (۲: ۱۷)	گواہ ہو۔

اب سوچئے کہ آپ کی اس مسامحت اور درگذر کا فلسفہ کہاں رہتا ہے۔ اگر دنیا میں کوئی ایسی سوسائٹی
قائم ہو جائے کہ جس کا ہر فرد یہ اپنا فرض سمجھے کہ چھوٹی سے چھوٹی غلطی پر بھی وہ اپنے ابنائے جنس کو متنبہ کردیا کریگا۔

ملہ بشرطیکہ مقصد اس سے اصلاح اور خیر ہو نہ کہ دوسرے کی تحقیر و تذلیل۔ پرویز۔

تو بڑے بڑے جرم جو فی الحقیقت اپنی چھوٹی چھوٹی ابتدائی غلطیوں کے آخری نتائج ہوتے ہیں، دنیا سے نیست و نابود ہو جائیں لیکن جس سوسائیٹی کے افراد سے احتساب کا احساس اٹھ جائے۔ غلط روی اس سوسائٹی کی گویا، فطرتِ ثانیہ ہو جاتی ہے اور آہستہ آہستہ عیب کو عیب شمار ہی نہیں کیا جاتا۔ یہی حالت آج ہماری ہو چکی ہے۔[1]

ان مواقع کا تعین مشکل ہے کہ کہاں کہاں عفو و تسامح سے کام لینا چاہئے اور کہاں کہاں انتقام و مواخذہ ضروری ہو جاتا ہے۔ لیکن ایک چیز بالکل واضح ہے جسے بطور اصول کے پیش نظر رکھنا چاہئے یعنے جہاں آپ کی اپنی ذات کا تعلق ہو۔ اور مجرم اس سے ناجائز فائدہ نہ اٹھا رہا ہو وہاں آپ کو اختیار ہے کہ نرم روی عفو درگذر، پاس و لحاظ سے کام لیں لیکن جہاں حق و باطل کا مقابلہ آ پڑے وہاں ہر حال میں حق کی تائید اور باطل کی تردید آپ پر لازم آ جائے گی۔ قرآن کریم نے عفو۔ درگذر۔ نرم روی خوش خلقی حلم اور انکسار کو مومنین کی صفات قرار دیا ہے۔ خود جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ارشاد ہے۔

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ۔ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ (۳ : ۱۶)

پس خدا کی رحمت سے آپ ان کے لئے نرم خو ہو گئے ورنہ اگر آپ تند خو سخت طبیعت ہوتے تو یہ آپ کے پاس سے سب منتشر ہو جاتے۔ پس ان کو معاف کر دیجئے اور ان کے لئے بخشش مانگئے۔

یہ موقع عام طور پر حسن اخلاق۔ کشادہ روئی۔ صبر و تحمل کا تھا لیکن جب کفر و ایمان حق و باطل صدق و کذب کے مقابلہ کا موقع آیا تو حکم ملا کہ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ان پر سختی کرو۔ اس لئے کہ مفسدین سے نرمی برتنا دنیا کو فساد اور شر کا گھر بنانا ہے ان احکام کی تفسیر، ان نازک مواقع کا تعین، یہ باریک سی حد بندی ہمیں مخبر صادق، قرآن ناطق کے نقوش قدم میں صاف اور بیّن طور پر ملتی ہے۔ اہل مکہ نے ہر ممکن اذیت پہنچانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ جان تک لینے کے منصوبے باندھے۔ کئی مرتبہ حضور سے صحابہ رضی نے عرض بھی کیا کہ آپ ان کے لئے بد دعا ہی کیجئے لیکن قربان جائیے اس رحمتِ دو عالم کے عفو کریمانہ کے

[1] کہا جاتا ہے کہ آج کل چونکہ کسی میں حق سننے کی تاب نہیں اس لئے حق گوئی کے لئے فضا سازگار نہیں ہے لیکن یہی کمزوری ایمان ہے۔ حق گوئی کا تو بہترین وقت وہی ہے۔ جب باطل کا زور ہو۔ پرویز

کہ اپنے ذاتی انتقام کے لئے بد دعا تک نہ کی لیکن ایسی بے کسی کے عالم میں اہل مکہ کا ایک وفد حضورؐ کی خدمت میں آتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ آپ کو ہم اپنا بادشاہ تسلیم کر لیتے پر تیار ہیں اور جو کچھ چاہیں ہم مان لینے پر آمادہ ہیں لیکن ہمارے معبودوں کی تکذیب چھوڑ دیجئے اور تو اور خود حضورؐ کے چچا ابوطالب تک نے کہدیا کہ محمدؐ کیا ہرج ہے اگر ایسا کر لو" لیکن یہ حق و باطل کا مقابلہ تھا۔ اس مقام پر ان کا کوئی لالچ حضورؐ کو پھسلا سکا۔ نہ ان کی طرف سے آنے والے مصائب قدم میں لغزش پیدا کر سکے۔ فرمایا۔ اور صاف صاف فرمایا کہ۔

لو جئتمونی بالشمس حتیٰ تضع فی یدی ما سئا لتکم غیرھا۔ (بخاری)

اگر تم میں ایسی قوت و طاقت پیدا ہو جائے کہ سورج کو آسمان پر سے اتار کر میری ہتھیلی پر رکھدو۔ جب بھی طلب حق کے سوا تم سے اور کچھ نہ چاہوں گا۔ اور وہی کہوں گا جو کہہ رہا ہوں۔

اور خود قرآن نے اس پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔ کہ

فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِينَ ۝ وَدُّوا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُونَ وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِينٍ ۝ (۶۸ : ۱)

ان تکذیب کرنے والوں کی باتوں میں نہ آنا۔ یہ لوگ چاہتے ہیں کہ آپ اپنے کام میں (کچھ ڈھیلے ہو جائیں۔ آپ اس کا کہنا کبھی نہ مانئے جو (بڑھ بڑھ کر قسمیں کھا رہا ہے اور بے وقعت ہے۔

ظاہر یہ ایسا وقت تھا کہ بہ تقاضائے مصلحت ان سے مداہنت برتی جاتی لیکن حضورؐ نے ایسا نہیں کیا اور اس طرز عمل پر حضورؐ کو قرآن کریم نے فرمایا۔ وَإِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ (قلم) بیشک آپ خلق حسن کے اعلیٰ مقام پر ہیں۔ حق و صداقت کے راستے میں روڑے اٹکانے والوں کے خلاف جان و مال سے جہاد کیا لیکن جب ان کفار پر آخری فتح حاصل کی۔ اور فاتح و منصور اس شہر میں داخل ہوئے جسے انہی دشمنوں کی شقاوت قلبی نے چھڑا دیا تھا۔ تو وہ تمام دشمن پابزنجیر سامنے کھڑے تھے۔ وقت تھا کہ عمر بھر کے مصائب کا آج بدلہ لیا جاتا لیکن یہ بدلہ ذاتی ہو جاتا فرمایا کہ لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ۔ آج کے دن تم نے

کوئی مواخذہ نہیں۔ رحمت دو عالم کا یہی وہ خلق تھا جس کی وجہ سے تمام کے تمام پاؤں میں آگرے۔ غرض جہاں اپنی ذات کا معاملہ تھا اس عفو کریمانہ سے کام لیا جس کی نظیر دنیا کی تاریخ پیش نہیں کر سکتی لیکن جہاں حق و باطل کا مقابلہ آیا، ذرا نرمی نہ برتی۔

اسی اخلاقی جرأت کے مظاہرے ہیں قرن اول کے مسلمانوں میں ملتے ہیں جنھوں نے شمع نبوت سے اکتساب ضیاء کیا تھا۔ حضرت عمرؓ (کہ جن کے سایہ سے شیطان بھاگتا تھا) بھرے مجمع میں لوگوں سے پوچھتے ہیں کہ اگر میں جادۂ حق و صداقت سے انحراف کروں تو میرے ساتھ کیا سلوک کرو۔" ایک بدو اٹھ کر کہتا ہے کہ "خدا کی قسم اس تلوار سے تمہارا سر اڑا دوں"۔ وہ پرستارِ صداقت باغ باغ ہو جاتے ہیں کہ اللہ کا شکر ہے کہ قوم میں اتنی جرأت ایمان موجود ہے۔ یہی نہیں، بھرے مجمع میں حضرت عمرؓ کو (جو امیر المومنین تھے) ٹوک دیا جاتا ہے کہ ہمیں بتاؤ یہ کرتا کہاں سے بنوایا؟ اور جب تک اطمینان بخش جواب نہیں ملتا، آگے نہیں بڑھنے دیتے۔ اللہ اللہ کس قدر جرأت تھی ان کہنے والوں میں! اور کس قدر بلند حوصلگی اور وسعت ظرف تھی ان سننے والوں میں۔

اگرچہ جب خلافت بادشاہی میں بدلی تو درباری زندگی اور عجمی اثرات نے خوشامد پرستی کا جذبہ پیدا کر دیا تھا لیکن پھر بھی ایمان کی یہ چنگاری اس میں اکثر اوقات شعلہ فشاں نظر آتی ہے۔ ہارون الرشید کے دربار میں ایک شاعر قصیدہ مدحیہ پڑھتا ہے جس میں وہ کہتا ہے کہ "اے خلیفہ اگر عمرؓ و علیؓ کے زمانہ میں آپ ہوتے تو خلافت پر کوئی جھگڑا ہی نہ پڑتا" (یعنی بلا اختلاف لوگ آپ کو خلیفہ منتخب کر لیتے) اہل دربار میں سے ایک مرد مومن اٹھتا ہے اور کہتا ہے کہ "کیوں غلط کہتے ہو۔ خلیفہ کے جد امجد حضرت عباس اس وقت موجود تھے پھر جھگڑا کیوں نہ چک گیا" کچھ اندازہ فرمایا آپ نے اس جرأت ایمان کا؟ شخصی حکومت۔ بھرا دربار لیکن حق و باطل کے مقابلہ میں کسی ڈرانے والے کا ڈر اسے باز نہ رکھ سکا۔ اور اعلائے کلمۃ الحق میں وہ رعب تھا کہ خلیفہ بھی سنکر مسکرا دیا۔ اور اسے کہنا پڑا کہ ٹھیک کہتے ہو۔

مامون الرشید کے عہد میں مسئلہ خلق قرآن نے جو قیامت برپا کر رکھی تھی کس سے پوشیدہ ہے۔

ایک صاحب ایمان (عبدالعزیز بن یحییٰ) اس جرات وصداقت کو قلب میں لیکر مکہ سے روانہ ہوتے ہیں اور جامع بغداد میں جاکر علی الاعلان کہتے ہیں کہ قرآن خدا کا کلام ہے۔ ہرگز ہرگز مخلوق نہیں ہوسکتا حالانکہ وہ خوب جانتے تھے کہ اس کہنے کا انجام کیا ہوگا۔

خوف طوالت مزید مثالیں پیش کرنے سے روک رہا ہے تاریخ امرا اسلام اٹھاکر دیکھیے اس جرأت ایمان کی کتنی ہی مثالیں آپ کے سامنے ہوں گی۔ یہ کیوں تھا؟ اس لئے تھا کہ ان کے سامنے قرآن عظیم کی تعلیم اور حضور نبی اکرمؐ کا اسوۂ حسنہ موجود تھا حضورؐ نے فرمایا۔

مَن رأى منكم منكرا فليغيره بيده ومن لم يستطع فبلسانه ومن لم يستطع فبقلبه وذلك اضعف الايمان۔ (ترمذی شریف)

جو مسلمان کسی برائی کو دیکھے وہ اسے اپنے ہاتھ سے ذرے مٹادے اگر اس کو استطاعت نہ ہو تو زبان سے برا کہے اگر یہ بھی نہ ہوسکے تو دل ہی میں برا سمجھے مگر یہ سب سے کمزور ایمان ہے۔

لگر قید استطاعت سے یہ مراد نہیں کہ آپ اپنی جرأت اخلاقی کو خود بخود کم کرتے جائیں اور "عدم استطاعت" کی آڑ میں ہر طرح کی منافقت پر اتر آئیں۔ بلکہ استطاعت کا موازنہ مقابلہ کی مجبوریوں سے ہوگا۔ قرآن کریم میں صرف ایک موقع ایسا ہے جہاں اتنی اجازت دی ہے کہ صرف جان بچانے کی خاطر اگر زبان سے کفر کا اقرار کرلیا جائے تو مباح ہے یعنی وہاں بھی صرف اجازت ہے۔ حکم نہیں۔

مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْ بَعْدِ اِيْمَانِهٖٓ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ وَلٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (۱۶:۱۰۶)

جو کوئی ایمان لانے کے بعد کفر کرے بجز اس کے کہ وہ مجبور ہی کیا گیا ہو اور اس کا دل ایمان پر مطمئن ہو۔ مگر جو دل کھول کر کفر کرے تو ایسوں پر اللہ کا غضب ہے اور بھاری عذاب ہے۔

لیکن آپ محض ہر دلعزیز ہونے کی خاطر، ممدوح خلائق بننے کے لئے، لوگوں کی ملامت سے بچنے کے کارن

منافقت اختیار کریں تو یاد رہے کہ قرآن کریم میں اس کے لئے بڑی سخت سرزنش آئی ہے۔ فرمایا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِى اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ ...... وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ (۵ : ۸)۔

اے ایمان والو جو تم میں سے اپنے دین سے پھر جائے تو اللہ تعالیٰ بہت جلد ایک ایسی قوم لے آئے گا جن سے اللہ کو محبت ہوگی اور اللہ سے ان کو محبت ہوگی۔ (ان کے اوصاف یہ ہونگے کہ) وہ ایمان لانے والوں کے آگے منکسر المزاج اور نہ ماننے والوں پر سخت گیر ہونگے۔ وہ اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہوں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کا (قطعاً) کوئی خوف ان کے دل میں نہ ہوگا۔ یہ اللہ کا فضل ہے جسے وہ عطا فرمائے اللہ بڑی وسعت والا اور علم والا ہے۔

گویا کسی کی ملامت سے نہ ڈرنا اور بلا خوف و خطر سچی بات کہدینا یہ خصوصیت ہے اس قوم کی جو اللہ کو محبوب ہے اور اس اخلاقی جرأت کو اللہ تعالیٰ نے اپنی خاص رحمت فرمایا ہے۔

یہ بھی یاد رہے کہ قرآن کے نزدیک سب سے پہلا محاسبہ خود اپنے اعمال و نفس کا ہے اس کا اعلان ہے کہ

اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ (۲ : ۵)

(کیا غضب ہے کہ لوگوں کو تو نیک کام کرنے کو کہتے ہو۔ اور اپنی خبر نہیں لیتے حالانکہ تم کتاب کی تلاوت بھی کرتے ہو)

اس کے نزدیک سب سے بڑی سرزنش اور سب سے سخت ملامت خود ضمیر انسانی کی ہے یہی اس کا نامۂ اعمال ہے جو ہر وقت اس کے گلے کا ہار ہو کر لٹکتا رہتا ہے اور اسی کا احتساب سب سے زیادہ سخت گیر ہے۔

وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِىْ عُنُقِهٖ وَنُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰهُ مَنْشُوْرًا ۝ اِقْرَاْ كِتٰبَكَ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا (۱۷ : ۲)

اور ہم نے ہر انسان کا نامہ اعمال اس کے گلے کا ہار کر رکھا ہے جسے قیامت کے دن نکال کر اس کے سامنے پیش کر دینگے اور وہ اسے کھلا ہوا دیکھے گا۔ (پھر کہا جائے گا کہ) اپنا

نامۂ اعمال پڑھ لے آج خود تیرا نفس ہی تیرے لئے کافی محاسب ہے۔

لیکن باین ہمہ یہ خیال بھی غلط ہے کہ دوسرے شخص کو غلطی پر تنبیہ وہی کرے جو خود کبھی غلطی نہ کرتا ہو۔ گنہ گار کو اس کے گناہ کی تنبیہ وہی کرے جو خود معصوم ہو۔ اس کے تو یہ معنی ہیں کہ احتساب اعمال صرف حضرات انبیاء کرام علیہم السلام تک ہی محدود رہے۔ حالانکہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ مسلمانوں کے لئے عام ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ امر بالمعروف اور اصلاحِ نفس دو جداگانہ اور مستقل احکام ہیں۔ خود اپنے نفس کا تزکیہ و اصلاح سب سے مقدم ہے لیکن جب مسلمان کو دوسرا مسلمان نیکی کی طرف بلائے اور برائی سے روکے اُسے محتسب کے نامۂ اعمال کی تفتیش کرنے کے بجائے خود اپنے نفس کی اصلاح کی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔ نماز کے وقت اگر آپ سو رہے ہوں اور دوسرا شخص آپکے لئے جگائے تو کیا آپ اسلئے اٹھنے سے انکار کر دیں گے کہ جگانیوالا خود پابند نہیں ہے؟ اسکے لئے تو مسلمان ایک طرف کوئی غیر مسلم بھی آپ کو ہشیار کرے تو اس کا ممنونِ احسان ہونا چاہئے اِس میں کچھ کلام نہیں کہ قرآن کے نزدیک ایسے شخص کی کوئی عزت و توقیر نہیں جس کے اعمال و اقوال میں مطابقت نہ ہو۔ مسلمانوں کی کسی ممتاز صف میں اسے جگہ نہیں مل سکتی کیونکہ قرآن کے معیار کے مطابق۔

اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ۔ اللہ کے نزدیک وہی زیادہ بزرگ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے۔

لیکن آپ اپنی اصلاح کے لئے انظر ما قال و لا تنظر من قال۔ (یہ دیکھو کہ کیا کہا گیا ہے نہ یہ کہ کہنے والا کون ہے) کو پیش نظر کیوں نہ رکھیں محتسب اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہے اور اسی طرح اسے ٹوکنے والا کوئی اور مل جائیگا آپ کو تو اسکا شکر گزار ہونا چاہئے کہ اُسنے خبردار کر دیا کہ سنبھل کر قدم رکھنا آگے ہلاکت و تباہی کا عمیق و مہیب غار ہے چہ نہ یہ کہ اس کی طرف سے انتقامی جذبہ پہلو میں رکھکر ٹوہ میں رہا جائے کہ کب اُسے ٹوکنے کا موقع ملتا ہے لیکن آج سب سے بڑا ماتم یہ ہے کہ ہر شخص یہ سمجھے بیٹھا ہے کہ وہ کوئی غلطی نہیں کر سکتا اور باقی سب دنیا غلطی کرتی ہے۔

میں اصل مقصد سے ضمناً کچھ دور نکل گیا۔ کہہ یہ رہا تھا کہ کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کا خوف کئے

بغیر حق و باطل کے مقابلہ کے وقت۔ ہماری زبانیں حق کی حمایت کے لئے کھل جانی چاہئیں ۔ اس میں اگر کوئی ناراض ہوتا ہے تو ہونے دیجئے یاد رکھو کہ خدا اور شیطان میں سے بیک وقت ایک ہی کو تم راضی کر سکتے ہو لیکن آج تو یہ حالت ہے کہ بقول اکبر مرحوم۔

مغوی کو بُرا مت کہو ترغیب ہے یہ ۔۔۔ میں کس سے کہوں نفس کی تخریب ہے یہ
شیطاں کو رجیم کہہ دیا تھا اک دن ۔۔۔ اک شور مچا خلاف تہذیب ہے یہ

پس یقین جانئے کہ یہ صرف آج کی تعلیم ہے۔ قرآن سے اس کو کچھ واسطہ نہیں۔ اور ہمیشہ یاد رکھئے کہ نرم روی، سلامت پسندی، پاس خاطر، نہایت عمدہ عادات ہیں لیکن بشرطیکہ ان میں ایمان سلامت رہ جائے یہ نہ ہو کہ۔

معشوقِ ما بشیوۂ ہر کس موافق است ۔۔۔ با ما شراب خورد و بزاہد نماز کرد

اس منافقت سے تو یقیناً وہ کفر اچھا جس میں ظاہر و باطن کی مطابقت ہو۔

وفاداری بشرط استواری عین ایماں ہے۔ (غالب)

قرآن نے صرف دو راستے بتائے ہیں۔ قَدْ تَبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّ۔ حق اور باطل کفر اور اسلام، کذب و صدق، شرک اور توحید۔ اہرمن اور یزداں۔ ان میں سے جس پر دل ٹھکے اسے اختیار کر لو۔ مَنْ شَآءَ فَلْیُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْیَکْفُرْ۔ لیکن ان دونوں کے بین بین کوئی تیسری راہ قرآن میں نہیں ملتی۔ اگر تمہارا دل کوئی ایسی راہ پیش کرتا ہے اور دلیل یہ لاتا ہے کہ اس میں سلامت روی اور ہر دلعزیزی ملتی ہے، تو یاد رکھو یہ نفس شریر کا دھوکہ ہے۔

یُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَمَا یَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَھُمْ وَمَا یَشْعُرُوْنَ (۲ : ۲)

ایسے لوگ اللہ اور (اس کے) مومن (بندوں) کو دھوکا دینا چاہتے ہیں لیکن (حقیقت یہ ہے کہ) وہ خود اپنے نفس کو دھوکہ دیتے ہیں اور نہیں جانتے کہ وہ اپنے آپ کو دھوکہ دے رہے ہیں

شیطان جو پہلے دن سے ہی ذریت آدم کے پیچھے لگ گیا تھا۔ کبھی تو وہ خوف اور امید کے مہیب اور خوشنما دیوتاؤں کی شکل میں باہر سے حملہ کرتا ہے اور کبھی خود انسان کے حجلۂ دماغ میں ہر دلعزیزی اور عزت طلبی کے گمراہ کن مفہوم کی فریب کاریوں اور باطل آرائیوں کے ساتھ اندر سے حملہ آور ہوتا ہے پس اس کے تباہ کن حملوں سے بچنے کے لئے قرآن کا یہ فیصلہ ہر وقت پیش نظر رہنا چاہئے کہ۔

وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ (۶۳ : ۱) (حقیقی) عزت تو صرف اللہ اور اس کے رسول اور مومنین کے لئے ہے لیکن یہ منافق (اس حقیقت کو) سمجھتے نہیں۔

اقبال نمبر

مسلمانوں کا اور دنیائے اسلام کا

اقبال نمبر

علامہ سر اقبال کے حالات زندگی اُن کی شاعری پر ایک نہایت اعلیٰ کتابی صورت میں لاہور کے مشہور رسالہ نیرنگ خیال کا اقبال نمبر شایع ہوا تھا۔ یہ وہی ہے جو کتابی صورت کے ساڑھے چار سو صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ علامہ سر اقبال کی تازہ ترین تصویر اور بہت سی دیگر تصاویر بھی اس میں موجود ہیں۔

علامہ سر اقبال کے حالات زندگی اور ان کی شاعری کو سمجھانے کے لئے ہندوستان کے ایک درجن سے زاید اہل قلم نے نہایت قیمتی مضامین رقم فرمائے ہیں۔ یہ کتاب ہندوستان کے ہر پڑھے لکھے گھر میں ہونی لازمی ہے۔ قیمت دو روپیے محصول ڈاک ۵ ر۔ لیکن چند مہینوں کے لئے یہ کتاب صرف ۱۰ ار معہ محصول میں ملے گی آج ہی آرڈر دیجئے۔ علامہ سر اقبال کی دیگر تصانیف۔ بانگ درا۔ (اردو کلام) سے اسرار و رموز فارسی مثنویاں عے۔ پیام مشرق (سے)، زبور عجم للعہ جاوید نامہ صہ

ملنے کا پتہ نیرنگ خیال بک ڈپو شاہی محلہ لاہور

حاملانِ قرآن

شیخ محمد وارث عمادی

از

جناب مولوی محمد عثمان صاحب عمادی (بی ایس سی علیگ)

نام تو محض محمدؐ تھا، مگر حضرت صدیق اکبر سے لیکر حضرت شیخ عماد تک تمام علمی و روحانی نعمائے خاندانی آپ کو وراثت میں ملی تھیں، اس لئے راسخین فی العلم کے حلقہ میں محمد الوارث سے مخاطب ہوئے کہ آپ کی ذات وارث صفات انبیاء و المرسلین تھی۔ ابتلا و افتتان میں آپ اکثر پڑے، ارادت مندوں نے اس سے محفوظ رہنے کی دعا کے لئے جب جب درخواست کی ہمیشہ یہی فرماتے رہے أَحَسِبَ النَّاسُ أَنْ يُتْرَكُوا أَنْ يَقُولُوا آمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُونَ (۲۹:۱) کیا لوگوں نے یہ سمجھ لیا کہ وہ اتنا کہہ دینے پر کہ ہم تو ایمان لائے چھوڑ دیئے جائیں گے اور آزمایش میں نہ ڈالے جائیں گے؟

در مسلخ عشق جز نکو را نہ کُشند — لاغر صفتان زشت خو را نہ کُشند
گر عاشق صادقی ز کشتن مگریز — مُردار بود ہر آن کہ او را نہ کُشند

پاینده پور سے آپ نے فتن پور میں نقل مقام فرمایا جو نظام آباد سے متصل ایک معروف آبادی ہے حضرت ابو ایوب انصاری صاحب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت معاویہ ابن ابی سفیان رضی اللہ عنہما کے عہد میں غازیان مدینۂ قیصر کے اول جیش میں تھے جن کے لئے "مغفور لہم" کی بشارت تھی۔ آپ کی ضرب شمشیر کا نشان دیوار قسطنطنیہ پر اب تک مرتسم ہے۔ وہیں آپ شہید ہوئے اور اسی عہد میں قیصر نے آپ کے مشہد مبارک سے متعدد کرامتیں مشاہدہ کرنے کے بعد ایک مسجد تعمیر کرا دی جو اب تک مقام ابی ایوب انصاری

کے نام سے شہرۂ آفاق ہے اور سلاطین آل عثمانؓ کی رسم تاج گذاری (تاجپوشی) وہیں ادا ہوتی تھی۔ حضرت ابوایوبؓ رضی اللہ عنہ کی اولاد سے ایک خاندان مدینہ مبارکہ سے چل کر گجرات میں فروکش ہوا اور یہاں فتن کے نام سے ایک معمورہ بسایا جسے باختلاف لہجہ پٹن بھی کہتے ہیں اور اسی کا مُثنّٰی حضرت شیخ فرید شکر گنج قدس سرہٗ کا پاک پٹن بھی ہے جو اُن دنوں ؛ جودھن مشہور تھا۔ گجرات کی بوہرہ جماعت کے نامور دانشمند نہایۂ ابن اثیر کے مُلخّص اور مجمع بحار الانوار کے مولف شیخ محمد طاہر فتنیؒ اُسی فتن انصار کی یادگار تھے، یہ زمانہ سلاطین گجرات کا تھا جو بزرگان دین واتقیائے مخلصین کے خاص قدر شناس تھے۔ سقوط سلطنت کے بعد یہ مجمع علمی بھی منتشر ہوگیا اور میرزا عبدالرحیم بیگ کے عہد میں کہ خان خانان دولت اکبر شاہی تھا اس خاندان انصار کو کثرت فتن نے ترک فتن پر مجبور کیا۔ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةٌ میں مراغم کی تلاش کرتے ہوئے سرائے میر علی عاشقان قدس سرہٗ تک پہونچا جن کا دست گرفتہ شیر شاہ بادشاہ دہلی تھا۔ حضرت شیخ کی روحانیت نے اس خاندان کے لئے وہ سرزمین منتخب فرمائی جو اپنے وطن (فتن، گجرات) کے نام پر ان بزرگوں نے یہاں بسائی اور امتداد ایام سے فتن پور موسوم ہے، اس خاندان کے بزرگ قاضی قطب الدین تھے جن کی شریعت پناہی قضائے شرعی کی مسند آرائی کر چکی تھی۔ فتن پور انہیں کی یادگار ہے۔

حضرت شیخ محمد وارث نے اسی فتن پور کو یاد آلٰہی کے لئے پسند فرمایا اور اسی خاندان انصار میں نکاح کر کے یہیں رہ پڑے، اس خاندان کا مجد و شرف اب تک زبان زد ہے اور آل عماد کے ساتھ آج تک اس کے تعلقات قائم ہیں۔

حضرت محمد وارث اگرچہ شیخ المہاجرین تھے مگر فتن پور میں سید الانصار کی حیثیت میں مقیم رہے اور اسی "مقعدِ صدق" میں "ملیکِ مقتدر" سے جا ملے۔ شیخ عبدالرحیم صاحب مرحوم کے خانہ باغ میں ایک مرتفع چبوترہ ہے جسے قاضی قطب الدین کا روضہ کہتے ہیں۔ وہیں آپکا مزار مبارک ہے جس کے پائیں میں اہل خاندان کی قبریں ہیں۔

ارادت مندوں نے ایک مرتبہ درخواست کی کہ کفار فجار نے آل عماد کو خانہ بدر کر دیا آپ اُن کو بددعا کیجئے' فرمایا' رَبَّنَا اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّ ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ (۲: ۲۳۳)۔ دیکھو اللہ تعالیٰ نے کیسی حکیمانہ ترتیب رکھی ہے جس کا پہلا درجہ افراغ صبر' دوسرا ثبات قدم' پھر سب کے آخر میں نصرت علی الکافرین ہے' ایما یہ ہے کہ پہلے پہلی منزلت کے لئے پھر دوسری کے لئے پھر آخری نتیجہ کے لئے حسن توفیق کے طلبگار رہو۔ زبان ہی سے نہیں بلکہ فعل سے بھی' ارہاب عدو اللہ درجۂ نصرت سے فروتر ہے مگر وہاں بھی اعداد قوت بقدر استطاعت و رباط خیل کا حکم ہے۔ اس عالم ظاہر میں بدون اس کے ارہاب و ترہیب میسر ہی نہیں'

فرماتے تھے صبر کے متعدد معنی ہیں مثلاً۔

۱۔ حبس و اکراہ۔ اور یہی اصل معنی ہیں' حدیث میں ہے' نھٰی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن "صبر" ذی الروح۔ یعنی صبر کے معنی بھی یہیں سے پیدا ہوئے ہیں۔

۲۔ استادگی اور اسی سے نصب للقتل کے معنی نکلے' حدیث میں ہے' نھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن قتل شیٔ من الدواب صبرًا"۔ آختگی کا مفہوم بھی یہیں سے نکلا ہے جس کے لئے عبداللہ بن مسعود کی روایت میں لفظ "صبر" وارد ہے۔

۳۔ خودداری بوقت حذر۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ (۱۸: ۴)۔

۴۔ بردباری۔ حدیث میں ہے۔ لا احدٌ اصبر علٰی اذیً یسمعہ من اللہ عزّوجلّ۔

۵۔ استقامت۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ۔

۶۔ ثبات۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے" اِسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ

۷۔ کفالت حسنؓ کی حدیث میں یہی مراد ہے جہاں "صبیر" معنی کفیل آیا ہے۔

۸۔ سرداری و زعامت۔ یقال صبیر القوم زعیمھم المقدم فی امورھم

۹۔ قصاص۔ حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کی سخت کلامی سے حضرت عثمان ذی النورین رضی اللہ عنہ کو غیظ آگیا اور زد و ضرب سے پیش آئے، صحابہ نے جب ان کی شکایت کی تو حضرت عثمانؓ نے جواب دیا۔ ھذہ یدی لعمار فلیصطبر یعنی میں حاضر ہوں، عمار آئیں اور سے بدلے لیں۔

۱۰۔ کمال شدت۔ اصمعی کہتے ہیں۔

اذا لقی الرجل الشدۃ بکمالھا قیل لقیھا باصبارھا۔

۱۱۔ جمع۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے' دخلت علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم وان عند رجلیہ قرظاً مصبوراً۔

۱۲۔ تراکم و تکاثف۔ اسی لئے ابر کو صبیر کہتے ہیں جس کا سبب بخارات کا تکاثف ہے

۱۳۔ سختی و غلظت۔ اعشیٰ کے شعر میں اسی لئے پتھر کو "صبارہ" کہا ہے اور اسی بنا پر صبیر پہاڑ کو کہتے ہیں

۱۴۔ امیر المومنین علی بن ابی طالب کے خطبہ میں سخت سردی کے لئے صبارہ کا لفظ آیا ہے جس طرح سخت گرمی کے لئے حمارہ ہے (صبارۃ القر و حمارۃ القیظ)۔

۱۵۔ جرأت و جسارت۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ فَمَا اَصْبَرَھُمْ عَلَى النَّارِ۔

دیکھو اللہ تعالیٰ حصول نصرت کے لئے جہاں تم کو صبر کی تاکید کرتا ہے وہاں تم سے متوقع ہے کہ ضبط نفس، استادگی، خودداری، بردباری، استقامت، ثبات، کفالت، سرداری، طاقت انتقام، شدت، جمعیت، سختی، حرارت، جرارت، وغیرہ کی شان اپنے آپ میں پیدا کرو کہ یہی صبر کے معنی ہیں

اسی ذیل میں ایک بات یہ بھی قابل تذکرہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو بھی "صبور" کہتے ہیں جس کے معنی

"حلیم" کہے ہیں، فرق یہ ہے کہ "صبور" کہنے کی صورت میں عقوبت سے رستگاری کی اتنی توقع نہیں جتنی "حلیم" کہنے کی صورت میں ہے۔

حلقہ درس فراخ تھا، وہ تھے اور کلام اللہ کا مفہوم، وَمَا نُنَزِّلُهٗٓ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ۔

سوال ہوا۔ "قضاء" و "امر" و "کن فیکون" کے کیا معنی ہیں؟ فرمایا، "قضا" بہت سے معنی میں مشترک ہے۔

۱۔ خلق ومنہ فَقَضٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ۔

۲۔ علم ومنہ وَقَضَيْنَآ اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ فِي الْكِتٰبِ۔

۳۔ امر ومنہ وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ۔

۴ لزوم ومنہ قضیٰ کل ذی دَینٍ فوفّٰی غریمہٗ
وَعزّۃ فی مطلِ مُعنًّی غریمُہا۔

۵۔ توفیہ ومنہ فَلَمَّا قَضٰى مُوْسَى الْاَجَلَ۔

۶۔ ارادہ ومنہ اذا قضیٰ امراً۔

کلام اللہ میں کلمہ "امر" کا اطلاق چودہ معانی پر ہوا ہے:۔

۱۔ دین ومنہ "حَتّٰى جَآءَ الْحَقُّ وَظَهَرَ اَمْرُ اللّٰهِ"

۲۔ قول ومنہ "فَاِذَا جَآءَ اَمْرُنَا"

۳۔ عذاب ومنہ "لَمَّا قُضِيَ الْاَمْرُ"

۴۔ عیسیٰ بن مریم ومنہ فَاِذَا قَضٰٓى اَمْرًا ای اوجد عیسیٰ علیہ السلام۔

۵۔ قتل ومنہ فَاِذَا جَآءَ اَمْرُ اللّٰهِ"

۶۔ فتح۔ ومنہ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ" اے امر فتح مکہ

۷۔ جلاء ومنہ فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ" ای بامر جلاء

النضیر و بنی قریظہ "

۸۔ قیامت ومنہ "اَتیٰ اَمْرُ اللّٰہِ"۔

۹۔ قضاء ومنہ۔ "یُدَبِّرُ الْاَمْرَ"۔

۱۰ وحی۔ ومنہ "یَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ بَیْنَهُنَّ"۔

۱۱۔ اعمال خلق ومنہ "اَلَا اِلَی اللّٰہِ تَصِیْرُ الْاُمُوْرُ"۔

۱۲۔ نصرت ومنہ "هَلْ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَیْءٍ"

۱۳ ایذنب ومنہ۔ "فَذَاقَتْ وَبَالَ اَمْرِهَا"۔

۱۴۔ شان ومنہ "وَمَا اَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِیْدٍ"۔

رہی یہ بات کہ کن فیکون سے کیا مراد ہے توحقیقت کا علم اللہ ہی کو ہوگا۔ البتہ اللہ تعالیٰ نے ایک دوسرے مقام پر فرمایا ہے۔ "وَمَا اَمْرُنَا اِلَّا وَاحِدَۃٌ کَلَمْحٍ بِالْبَصَرِ" اور اسی لئے قاضی بیضاوی "کن فیکون" کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

لیس المراد حقیقۃ اَمر و امتثالٍ بَلْ تمثیلُ حصولِ ما تعلقت بہ ارادتہ بلا مُھلۃٍ بطاعۃ المامور المطیع بلا توقفٍ"

قرآن مجید کا انگریزی ترجمہ

از

(از جناب مولانا عبدالماجد بی اے دریابادی)

اس مرتبہ "اشارات" لکھے جاچکے تھے کہ "سچ" کا خاص نمبر وصول ہوا جس میں مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی نے قرآن مجید کے ایک مستند انگریزی ترجمہ اور تفسیر کی ضرورت ظاہر کرتے ہوئے اپنی ان کوششوں کا ذکر فرمایا ہے جو اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے انہوں نے شروع کی ہیں، اور ان ضروریات کو بھی بیان کر دیا ہے جن کا پورا ہونا اس کام کے لئے ضروری ہے ہم اس مضمون کو ناظرین ترجمان القرآن کی واقفیت کے لئے یہاں نقل کرتے ہیں۔ یہ مسلم ہے کہ نہ صرف انگریزی دان غیر مسلموں کو بلکہ خود مسلمانوں کی جدید تعلیمیافتہ جماعت کے ایک بڑے گروہ کو بھی اسلام کی صحیح واقفیت بہم پہونچانے کے لئے انگریزی زبان میں ایک صحیح اور مستند ترجمہ و تفسیر قرآن کی سخت ضرورت ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی مسلم ہے کہ اس وقت ہمارے جدید تعلیمیافتہ گروہ میں اگر کوئی شخص اس خدمت کے لئے سب سے زیادہ موزوں ہے تو وہ مولانا عبدالماجد دریابادی ہیں۔ اس لئے کہ وہ قریب قریب ان تمام منزلوں سے گذر چکے ہیں جن میں آج کل کے مغربی تعلیمیافتہ حضرات عموماً بھٹکا کرتے ہیں۔ ان کو وہ تمام راستے معلوم ہیں جن سے شک اور الحاد دماغوں میں داخل ہوتا ہے۔ اور خدا کے فضل سے ان کے پاس وہ اسلحہ بھی موجود ہیں جن سے موجودہ دور کے الحاد و تشکیک کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ ایسے موزوں شخص کے مل جانے کے بعد یہ سوال تو حل ہو گیا کہ کام کرنے والا کون ہے؟ اب صرف یہ سوال باقی

رہ جاتا ہے کہ کام کرنے کے ذرایع کہاں سے مہیا ہوں؟ اس دوسرے سوال کا حل صرف مسلمانوں کے جذبۂ خدمت دین پر موقوف ہے۔ اگر ضرورت کا صحیح احساس اور خدمت کا سچا جذبہ موجود ہو تو یہ قوم کم از کم اتنی گئی گذری نہیں ہے کہ چند ہزار روپے کی کتابیں بھی فاضل مترجم کو مہیا نہ کر سکے

ایڈیٹر

کلام مجید کا کوئی ترجمہ انگریزی میں کچھ یہ نہیں ہے کہ سرے سے موجود ہی نہ ہو۔ ایک چھوڑ کئی کئی ترجمے موجود ہیں غیروں کے کئے ہوئے بھی اور اپنوں کے قلم سے بھی . . . . معرّیٰ بھی اور محشّٰی بھی۔ ان سب میں سے قدیم ترجمہ پادری جارج سیل کا ہے، جو اٹھارویں صدی کا انسان تھا۔ اس بیچارے کی عربی استعداد غالباً کچھ یوں ہی سی تھی۔ اس لئے غلطیاں بکثرت رہ گئیں۔ اور کہیں کہیں جھلک تعصب و عناد کی بھی نظر آجاتی ہے۔ تاہم نقش اول کے لحاظ سے اس کا ترجمہ قابل قدر، اور متن و حواشی دونوں میں اس کی محنت قابل داد ہے اور ترجمہ سے قبل اس کا مبسوط مقدمہ تو مفید ترین معلومات سے لبریز ہے جس سے آج بھی بے نیازی نہیں برتی جا سکتی۔ ترجمہ کی زبان امتداد زمانہ سے بہت پرانی ہوگئی ہے۔ اور بہتیرے الفاظ متروک ہے۔

سیل کے بہت عرصے کے بعد انیسویں صدی کے ثلث آخر میں، دوسرا انگریزی ترجمہ پادری جے۔ ایم۔ راڈویل کا شائع ہوا۔ ان حضرت نے ترجمہ بڑے دعوی کے ساتھ کیا، اور جہاں تک زبان کا تعلق ہے، راڈول کی زبان سیل سے بے شبہ کہیں زیادہ شگفتہ و رواں ہے لیکن نافہمی کی بنا پر اس کے اغلاط کا شمار بھی سیل سے کم نہیں، اور تعصب و عناد کا تو یہ شخص پتلا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق خبث نفس کا اظہار اپنے مختصر حواشی میں اس دریدہ دہنی کے ساتھ کرتا گیا ہے کہ مسلمان کے لئے ان کا مطالعہ سخت صبر آزما بن گیا ہے۔ ایک جدت آپ نے یہ فرمائی ہے کہ قرآن پاک کی ترتیب بدل دی ہے، اور اپنے خیال و پندار کے مطابق سورتوں کو ان کی ترتیب نزولی کے اعتبار سے مرتب کیا ہے۔

تیسرا ترجمہ ۱۸۸۰ء میں ایک انگریز ای ایچ پامر کے قلم سے نکلا ہے جو شام و عرب وغیرہ میں ایک مدت تک اہلِ زبان کے ساتھ رہ چکے تھے، اور کیمبرج یونیورسٹی میں عربی کے معلم بھی تھے۔ ایک عربی گرامر کے بھی مصنف ہیں۔ توقع تھی کہ یہ ترجمہ، کم از کم فہمِ زبانِ قرآنی کے اعتبار سے تو محققانہ ہوگا لیکن خلافِ توقع اس ترجمہ میں بھی گو سیل ورا ڈول سے کمتر، پھر بھی خاصی تعداد میں نافہمی کی مثالیں موجود ہیں۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ایک تو مترجم نے کام کی اہمیت کے مناسب وقت نہ دیا، چلتا ہوا کام سمجھ کر محض سرسری طور پر کر دیا۔ دوسرے یہ کہ احکم الحاکمین کے کلام کو محض ایک بدوی عرب کا کلام سمجھا، اور ترجمہ بالکل اس انداز سے کیا، کہ گویا کسی بدوی کے خطبات کو وہ انگریزی میں منتقل کر رہا ہے! پھر حواشی بھی اس ترجمہ میں برائے نام ہیں۔ البتہ پہلے ایڈیشن میں مترجم کا ایک مبسوط مقدمہ ہے، جو دوسرے اور ارزاں ایڈیشن میں نکال دیا گیا، اور بجائے اس کے پروفیسر نکلسن کے قلم کا ایک دلآزا مختصر مقدمہ شامل کر دیا گیا ہے۔

یہ تینوں ترجمے ان افراد کے قلم سے تھے، جو قرآن کے کلامِ الٰہی ہونے کے منکرین ہوئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسوں کے ذہن پر کلامِ مجید کیسے کھل سکتا تھا؟ غیرتِ خداوندی کیونکر اسے گوارا کر سکتی ہے، کہ انوارِ قرآنی کو سیاہ سینوں کے اندر جگہ ملے؟ ان تین مکمل ترجموں کے علاوہ ایک ترجمہ بعض اجزائے قرآنی کا، لین کا بھی کیا ہوا ہے، جو اس وقت نایاب ہے۔ لین عربی زبان کا مشہور ماہر اور مستند لغوی تھا۔ مدالقاموس اسی کی تصنیف ہے۔ اس کا ترجمہ بڑی تلاش کے بعد بھی، اب تک کہیں نہ مل سکا۔ لیکن لین کی شخصیت سے توقع یہ ہوتی ہے، کہ یہ ترجمہ، کم از کم نحوی و لغوی نافہمیوں سے تو ضرور محفوظ ہوگا۔

مسلمان مترجموں میں تبرکاً سب سے پہلا نام زبان پر ڈاکٹر عبدالحکیم خاں مرحوم پٹیالوی کا آتا ہے۔ ترجمہ جیسا بھی کچھ ہو، بہرحال مترجم کو سب سے پہلی کوشش کا اجر ضرور ملے گا، اور ان کے السابقون الاولون میں شامل ہونے کے فخر کو کوئی نہیں چھین سکتا۔ ان کے بعد ایک ترجمہ، تین مختصر جلدوں میں، مرزا حیرت دہلوی کے

نام سے ملتا ہے۔ اس میں حواشی برائے نام ہیں اور ترجمہ ابتدائی کوشش کے لحاظ سے غنیمت ہے۔ حافظ غلام سرور (جج ہائیکورٹ پٹنا) کا تازہ ترین ترجمہ محاسن ظاہری کے لحاظ سے قابل داد ہے لیکن حواشی سے بالکل معرّیٰ جس کے باعث بہت سے مقامات اجنبیوں کے لیے ناقابل فہم رہ گئے ہیں۔ اور جہاں تک نفس ترجمہ کا تعلق ہے افسوس ہے کہ اس میں بھی مترجم صاحب ترجمہ کی زبان کو ادیبانہ وشاعرانہ بنانے کی سعی میں، الفاظ قرآنی سے بہت دور جا پڑے ہیں۔ اور انکا ترجمہ بجائے اس کے کہ ایک سنجیدہ دینی ضرورت کو پورا کرے، گستاخی معاف، کچھ ایک ادبی تکلف کی سی چیز بن کر رہ گیا ہے۔

غالباً ۱۳۱۴ء میں حیدر آباد میں نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی مرحوم نے، بڑے ساز و سامان کے ساتھ ترجمہ کا ارادہ فرمایا۔ نواب صاحب گو خاندانی شیعہ تھے لیکن اپنے ذاتی عقاید کے لحاظ سے نیم سنی ضرور تھے، عربی و انگریزی دونوں کے ادیب تھے، گو علوم دینیہ کے ماہر نہ تھے نصف قرآن سے کچھ زائد کر چکے تھے، کہ مولانا حمید الدین فراہیؒ سے ربط و ضبط بڑھا۔ مولاناؒ (صاحب نظم القرآن عربی) اس دور میں قرآن فہمی کے لحاظ سے دنیائے اسلام میں اپنی نظیر بس آپ ہی تھے۔ مولانا مرحوم کے مشورہ سے نواب صاحب نے اپنے ترجمہ کی نظر ثانی شروع کی مسودہ شاید سورۂ طٰہٰ تک پہونچا تھا کہ نواب صاحب کی خرابی صحت نے کام روک دیا۔ اور پھر دونوں صاحبوں کا انتقال ہو گیا۔ اتنے اجزاء کے چند نسخے نواب صاحب نے اپنے خاص احباب سے مشورہ کے لیے طبع کرائے تھے، عام اشاعت کسی ایک جزو کی بھی نہ ہو سکی۔ یہ ترجمہ بڑی احتیاط سے کیا ہوا ہے، اور زبان کے لحاظ سے بھی اس کا معیار بہت بلند ہے۔ کاش اس کی تکمیل ہو گئی ہوتی! نامکمل رہ جانے سے قطع نظر دو بڑی کوتاہیاں اس قابل قدر ترجمہ میں بھی ہیں۔ ایک یہ کہ یہ نرا ترجمہ ہی ترجمہ ہے، کوئی حاشیہ برائے نام بھی نہیں۔ دوسرے یہ کہ اس کی انگریزی وہ ٹھیٹھ انجیلی انگریزی ہے، جو ۱۶۱۱ء سے بائبل کی زبان چلی آتی ہے۔ اردو میں اگر کوئی اس بیسویں صدی کے وسط میں، میر تقی میر کی زبان میں اشعار کہنا شروع کر دے، تو کتنے اس کے سمجھنے والے اور قدر کرنے والے نکلیں گے؟ اہل قادیان نے اپنے غالیانہ رنگ میں، ایک پارہ کا، مدرسۃ الواعظین (شیعہ) لکھنؤ نے بھی ایک پارہ کا

اور الٰہ آباد کے ایک صاحب نے اپنے "مجتہدانہ" رنگ میں شاید سارے قرآن کا ترجمہ کر ڈالا ہے۔ ان تراجم پر کسی تفصیلی تبصرہ کی نہ ضرورت نہ گنجایش۔

حقیقۃً قابل ذکر انگریزی ترجمے صرف دو ہیں۔ ان میں سے ایک مولوی محمد علی لاہوری ایم اے (امیر جماعت احمدیہ مرزائیہ) کا ترجمہ دی ہولی قرآن ہے، اس کا پہلا ایڈیشن شائع ہیں، دو قسم کے کاغذوں کے مع متن قرآن، ایک مفصل مقدمہ اور مفصل حواشی کے نفاست کاغذ و طباعت کے اعلیٰ لوازم کے ساتھ نکلا تھا، اور دوسرا بلا متن اس سے چھوٹی تقطیع پر محاسن ظاہری کی انھیں خصوصیات کے ساتھ ابھی سال دو سال ہوئے نکلا ہے۔ یورپ اور خود ہندوستان کا انگریز نما طبقہ جس ترجمہ سے سب سے زیادہ متاثر ہوا ہے اور جو ان کے درمیان سب سے زیادہ پھیلا ہے وہ یہی ترجمہ ہے۔ اس ترجمہ سے متعلق ایک خالص انگریزی خواں دوست کی رائے ملاحظہ ہو، جو ماشاءاللہ اپنے عقائد میں بالکل اہل سنت کے ہم مسلک ہیں:

> میں چونکہ ایک انگریزی خواں فضا میں رہتا ہوں، جہاں خواب بھی آئے تو انگریزی میں اس لئے انگریزی خواں طبقہ کی نبض کچھ پہچانتا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ انگریزی داں طبقہ خواہ عقائد کے لحاظ سے اہل سنت ہو یا آزاد خیال، کچھ اس کی افتاد اس قسم کی پڑ چکی ہے کہ وہ اب منقولات کے بجائے معقولات سے زیادہ مطمئن ہوتا ہے۔ محمد علی اپنی تفسیر میں قرآن سے اگرچہ بہت دور جا پڑے ہیں، لیکن وہ زمانہ شناس بہت واقع ہوئے ہیں۔ انہوں نے ہر چیز کو بالکل زمانہ کے موافق پیش کر دیا ہے، خواہ حقیقت کا اس میں شائبہ بھی نہ ہو، نتیجہ یہ کہ جس جماعت میں یہ قرآن پہونچا، وہ چونکہ قرآن سے قطعاً نابلد تھی، اس لئے اس کے اغلاط و اہمال کی تحقیق تو نہ کر سکی، لیکن چونکہ باتیں تھیں دل لگتی ہوئی، اس لئے سمجھ بیٹھی، کہ اسلام یہی ہو سکتا ہے۔ یہ ہے وہ زہر جو اس جماعت میں

پھیلایا گیا ہے۔ اور اسی زہر کا تریاق اب درکار ہے، جس کی شکل یہی ہو سکتی ہے، کہ صحیح قرآن و اسلام کو اسی شرح وبسط سے پیش کیا جائے جس صراحت سے غلط اسلام کی اشاعت ہو چکی ہے"۔ (مکتوب مورخہ مارچ ۳۴ء)۔

تشخیص صحیح ہے مولوی محمد علی صاحب کے ترجمہ کی خوبیوں سے، اس کے اثرات سے، اس کی تبلیغی کامیابیوں سے انکار کرنا آفتاب کی روشنی سے انکار کرنا ہے صدہا ہزارہا بیگانوں کو یگانہ بنانے، صدہا ہزارہا منکروں کو اسلام سے قریب لانے میں وہ یقیناً معین ہوا ہے۔ خود اپنے متعلق میں یہ اعتراف مسرت کرتا ہوں کہ آج سے پندرہ سولہ سال پیشتر جب میں الحاد وارتیاب کی تاریکیوں میں بھٹک رہا تھا، اس وقت گنتی کی دو چار کتابیں جو مجھے اسلام سے قریب لانے میں معین ہوئی تھیں، ان میں سے ایک یہی ترجمہ قرآن تھا، مترجم کے ہمنام مولانا محمد علی (مدیر کمریڈ) بھی اس سے بہت متاثر تھے، اور اس کی تعریف ہی کیا کرتے تھے لیکن ان سارے اعترافات کے ساتھ یہ بھی مجبوراً کہنا پڑتا ہے، کہ

۱۔ ترجمہ و تفسیر میں اسلام کی حقیقی تصویر پیش نہیں ہو سکی ہے۔ مترجم بدنام اپنی قادیانیت کے لئے ہیں لیکن ترجمہ و تفسیر میں 'قادیانیت' سے کہیں زائد غالب 'نیچریت' ہے، معجزات وغیرہ کے باب میں تقریباً تمامتر سید احمد خانی خیالات کی ترجمانی ہے۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ مریض اگر کڑوی دوا سے منہ بناتا ہے تو کنین کی گولی پر شکر خوب لپیٹ دینی چاہئے لیکن یہ تو نہ ہو کہ اس میں مبالغہ کرتے کرتے کنین سرے سے غائب ہو جائے، اور بخار کے مریض کو خالی شکر پھنکائی جاتی رہے! جدید خیالات کی مطابقت میں مترجم کو ضعیف سے ضعیف بھی جو تاویل مل گئی ہے بس اس کو بے تکلف اختیار کر لیا گیا ہے، اور لغت، نحو، حدیث، سیاق قرآنی، اجماع اکابر امت، کسی شے کی اس کے مقابلہ میں پروا نہیں کی گئی ہے۔

۲۔ شبہات جدیدہ کے جوابات دینے کی ایک خاصی حد تک کوشش کی گئی ہے، پھر بھی وہ حد بہت ناکافی ہے، اور مزید کوششوں کی ضرورت پوری طرح باقی ہے۔

۳۔ جا بجا فہم مطالب قرآنی میں بھی غالباً زیادہ وقت نہ دے سکنے کے باعث، لغزشیں ہوگئی ہیں، مثلاً آیہ مَا یَوَدُّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ اَھْلِ الْکِتَابِ وَالْمُشْرِکِیْنَ ان ینزل الخ میں نافہم انگریز مترجمین کی طرح المشرکین (مجرور) کا عطف الذین کفروا پر کر دیا ہے، جو صریحاً اہل الکتاب پر ہونا چاہئے تھا۔ وقس علیٰ ہذا۔

۴۔ زبان کا معیار بھی ہر جگہ زیادہ بلند نہیں۔ اور نہ حوالے ہر جگہ پوری طرح قابل اعتماد ہیں۔

دوسرا قابل ذکر ترجمہ نومسلم انگریز مارماڈیوک پکتھال صاحب کا ہے۔ پکتھال صاحب انگریز ہی نہیں بلکہ اپنی زبان کے ایک کہنہ مشق انشا پرداز بھی ہیں اس لئے زبان کے اعتبار سے ان کے ترجمہ کا کیا پوچھنا بے اختیار یہ جی چاہتا ہے کہ بار بار اسے پڑھے جائیے۔ اور لطف لئے جائیے! اتنی بہتر زبان تو ہم لوگ سالہا سال کی سعی و محنت کے بعد بھی نہیں پا سکتے لیکن افسوس ہے کہ صحت مطالب کے اعتبار سے، اس کا معیار خاصہ پست ہے۔ موٹی موٹی غلطیاں صرف پہلے پارہ میں ۱۵۔۲۰ کی تعداد میں ہونگی۔ جن میں سے بعض اس قدر کھلی ہوئی ہیں کہ بجز اتفاقی سہو نظر کے اور کسی سبب پر محمول ہی نہیں کیا جا سکتا۔ پھر حواشی بھی اس ترجمہ میں بمنزلہ صفر کے ہیں بحیثیت مجموعی یہ ترجمہ صرف اس قابل ہے کہ کوئی دوسرا مترجم اس کو زمین اور اصل قرار دے کر اسی پر اپنی محنت و تحقیق کے لحاظ سے ایک نئی عمارت تعمیر کرے۔

موجودہ تراجم کے اس اجمالی تذکرے سے ان کا ناکافی ہونا واضح ہوگیا، گو بعض ترجمے بجائے خود اپنے اپنے حدود کے اندر کیسے ہی نافع رہے ہوں۔ اب ضرورت اس کی ہے کہ ایک ترجمہ ایسا شائع کیا جائے، جو ایک طرف جمہور اہل سنت کے عقائد کا ترجمان ہو، مسائل میں قطع و برید کرنے والا نہ ہو، اور دوسری طرف ٹھیٹھ مولویانہ بھی نہ ہو۔ اس کی تشریحات ایسی نہ ہوں کہ پڑھنے والے کو جزئیات ہی میں الجھا دیں۔ جو ذہنیت یورپ کی اور یورپی تعلیم پائے ہوؤں کی ہے، اس کی رعایت حواشی میں خاص طور پر ملحوظ رہے، اور ترجمہ و تفسیر اس انداز سے

کی جائے کہ جدید شبہات حتی الامکان پیدا ہی نہ ہونے پائیں، ساتھ ہی زبان درست ہو اور کاغذ، جلد، طباعت وغیرہ کی دیدہ زیبی یوروپی مطبوعات کے معیار پر ہو۔

اس ضرورت کا احساس عرصۂ دراز سے تھا لیکن سوال ہمیشہ یہی رہا کیا، کہ **کون** اس ضرورت کو پورا کرے؟ کام اپنی اہمیت و وسعت کے لحاظ سے افراد کے نہیں، جماعت کے کرنے کا تھا۔ بائبل کے جیسے ترجمے مغربی زبانوں میں جماعتوں اور مجلسوں ہی نے کئے ہیں۔ اور جب کبھی ان ترجموں کی نظرثانی و ترمیم کی ضرورت محسوس ہوئی تو یہ فرض بھی کسی فرد نے، خواہ وہ مذہبی و علمی حیثیت سے کیسا ہی بلند پایہ ہو، نہیں بلکہ بڑی بڑی ذمہ دار جماعتوں ہی نے انجام دیا ہے —— یہاں جماعتوں اور مجلسوں کا کیا ذکر، افراد و اشخاص ہی کا وجود عنقا!

ابھی چند ماہ کا ذکر ہے، کہ اس فرض کا احساس، ایک عامی و بے علم ننگِ اسلام و ننگِ خلائق پر دفعۃً اس شدت سے مستولی ہوا، کہ اختیار اور اضطرار میں تمیز کرنا مشکل ہوگیا۔ دل نے کہا کہ آدمی جب دریا میں ڈوبنے لگتا ہے، تو کیا بے اختیار اپنے ہاتھ پیر مارنا نہیں شروع کر دیتا؟ کیا وہ وقت اس کے انتظار کا ہوتا ہے، کہ پہلے پیرنے کے فن کو باضابطہ کسی ماہر سے سیکھ لیا جائے، اور اس کے بعد ہاتھ پیر چلائے جائیں؟ جب گھر میں آگ لگتی ہے، تو کیا گھر والے فائر بریگیڈ کے انتظار میں ہاتھ پیر توڑے بیٹھے رہتے ہیں یا مضطر ہوکر دوڑ پڑتے ہیں اور جو جس سے بن پڑتا ہے، اس کوشش میں لگ جاتے ہیں؟ کوئی عزیز اگر جنگل بیابان میں سخت علیل ہوجائے، تو عزیزوں کے دل سے تو یہ نہ ہوگا، کہ کلکتہ اور بمبئی کے ڈاکٹروں اور لکھنؤ اور دہلی کے طبیبوں کے انتظار میں صبر کئے بیٹھے ہیں، بڑی بھلی تدبیر جو بھی بن پڑے گی بے تحاشہ فوراً شروع کر دیں گے —— صرفِ عمر محدود و زندگی کا بیشتر حصہ غفلتوں اور تباہ کاریوں کی نذر ہوچکا۔ اللہ پاک کے کلام کی خدمت کسی ادنیٰ درجہ میں بھی اگر مقبول ہوگئی، تو دنیا تو خیر جیسی گذری، گزری، عقبیٰ میں تو انشاء اللہ یکسر محرومی نہ رہے گی۔

اپنی طرف نظر گئی، تو عقل مسکرائی، اور جسارت خود دنگ ہو کر رہ گئی علمی استعداد، انگریزی میں بالکل مبتدیوں جیسی۔ عربی میں مبتدیوں سے بھی کمتر رہا تقویٰ و طہارت، سو ان الفاظ کے معانی سے تو کبھی دور کا بھی رشتہ نہیں رہا! اس بے بضاعتی پر یہ حوصلے! اس بے مائگی پر یہ ولولے! سنتے ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام جب بازار مصر میں فروخت ہونے کو آئے ہیں، تو ایک سیدھی سادھی ضعیفہ اپنے سوت کی پٹریاں لیکر انھیں خریدنے کو نکلی تھیں! چودھویں صدی ہجری کے وسط میں وہی روح ایک نئے قالب میں نمودار ہوئی! تاریخ کا اپنے آپ کو دوہرانا آخر کہتے کس کو ہیں؟ ان ضعیفہ کی سادہ دلی اگر تبسم کی مستحق تھی، تو یہ جسارت قہقہہ کے قابل! ——— لیکن پھر یاد پڑا، کہ جن کا کلام ہے، وہ جب کوئی کام کیا چاہتے ہیں، تو آلۂ کار کے ضعف و قوت کی پرواہی کب کرتے ہیں؟ کیا نمرود کی روایت سننے میں نہیں آئی، کہ ایک مچھر کو اس پر مسلط کر دیا گیا۔ کیا صاحب فیل ابرہہ کا واقعہ تاریخ میں نہیں گذر چکا ہے، کہ اس کے سارے لشکر اور ہاتھیوں کے غول کے لئے چند ابابیل چڑیاں اور ان کے ننھے پنجوں کی کنکریاں کافی ہوگئیں؟ کیا بڑے بڑے سائنسدانوں کا یہ متفقہ مشاہدہ نہیں ہے کہ بڑے بڑے کڑیل جوان روزمرہ، خوردبینی کیڑوں سے۔ طاعون اور ہیضہ کے پردے میں، ہلاک ہوتے رہتے ہیں؟

ہمت بندھی، اور دو تین مخصوص بزرگوں کی دعاؤں اور حوصلہ افزائیوں نے چیونٹی میں عقاب کا حوصلۂ پرواز اور گوسفند میں شیر کا دل و جگر پیدا کر دیا! ۴۳ھ ختم ہو رہا تھا، اور ۵۲ھ کا ماہ رمضان المبارک تھا کہ اللہ کا نام لے کر کام کو ہاتھ لگایا، اور ڈیڑھ دو مہینے میں پہلا پارہ جوں توں ختم ہوگیا لیکن جب نظر ثانی کی نوبت آئی، تو نظر آیا کہ حواشی بہت ناکافی رہے ابتدائی خیال یہ تھا کہ، صرف ترجمہ امکانی صحت کے ساتھ کر دیا جائے، اور حواشی مختصر بھی ہوں، اور صرف وہی ہوں، جہاں بغیر ان کے کسی طرح کام نہ چلے! لیکن کام کا کسی قدر تجربہ ہونے کے بعد، اور انگریزی مترجمین، خصوصاً راڈول کی شرارتوں کے

مشاہدہ کے بعد اس رائے پر قائم رہنا ناممکن ہو گیا، اور اس نظر سے جب نظر ثانی کی، تو کام کہنا چاہئے کہ بالکل نیا ہو گیا۔ ان ظالموں نے عجیب عجیب طریقوں سے زہر اگلا ہے، جن کی ہمارے قدیم مفسرین اور قدیم طرز کے علماء کو خبر بھی نہیں۔ اس زہر کا تریاق یوں ہی ہو سکتا ہے کہ حواشی خوب مفصل ہوں، اور مسائل کی تشریح یوں کی جائے، کہ شبہات از خود رفع ہو جائیں، مناظرانہ رد و قدح کی حتی الامکان نوبت ہی نہ آنے پائے ارادہ کرنے کو تو کر لیا گیا، لیکن اس نظریہ پر عمل کوئی آسان چیز ہے؟ اس کے لئے سب سے اہم ضرورت انگریزی کے ایک خاصہ بڑے کتب خانہ کی ہے، جس میں۔

(۱) توریت ہو، انجیل ہو، ان کی مختلف شرحیں اور حواشی ہوں عقاید یہود و نصاری سے متعلق مفصل اور دوسرے مذاہب و ادیان سے متعلق مجمل لیکن مستند معلومات کا ذخیرہ ہو۔ کلام مجید میں ان سب کا ذکر آیا ہے۔ جدید شارح کے لئے لازمی ہے کہ ان سب کے حوالے مخالفین ہی کی مسلمہ کتابوں سے تلاش کرے، ورنہ بجائے معتقد و متاثر ہونے کے موجودہ مخالفین کو قرآن پاک کی مخالفت کا اور زیادہ موقع ہاتھ آجاتا ہے، مثلاً یہود کا یہ عقیدہ کلام مجید میں نقل ہوا ہے کہ لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَیَّامًا مَّعْدُوْدَاتٍ، بجز چند روز کے ہمیں آتش دوزخ چھوئے گی بھی نہیں۔ آج ایک یہودی جھٹ اس عقیدہ ہی سے انکار کر سکتا ہے مترجم کی نظر جب تک اصل عقائد یہود اور ان کے ماخذ پر نہ ہو، وہ بے بس رہے گا۔ توریت و انجیل کے نسخے تو خیر، البتہ ان کی شروح و تفاسیر بڑی بڑی ضخیم ہیں۔ اور اسی لحاظ سے گراں قیمت بھی۔

۲۔ اہل کتاب کی کتب مقدسہ سے قطع نظر، ان اقوام کی تاریخ پر بھی عبور ہونا ضروری ہے۔ بنی اسرائیل کے ذکر میں آتا ہے وَاَنِّیْ فَضَّلْتُکُمْ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ بنی اسرائیل کی یہ افضلیت دوسری اقوام عالم پر کس لحاظ سے تھی حکومت کے لحاظ سے وسعت فتوحات کے لحاظ سے جاہ و ثروت کے لحاظ سے، یا دینداری کے لحاظ سے؟ اس قسم کے سوالات کا تشفی بخش جواب اسی وقت دیا جا سکتا ہے، جب مفسر کی نظر تاریخ اسرائیل پر بھی ہو، اور تاریخ اقوام معاصرین پر بھی۔ تاریخ اسرائیل نیز امم سابقہ پر انگریزی میں بکثرت تصانیف موجود ہیں۔

۳- تاریخ ہی سی اہم چیز عہد قدیم کا جغرافیہ بھی ہے۔ کلام پاک میں مختلف مقامات کے نام بکثرت آئے ہیں، جب تک ان مقامات و ممالک کے متعلق صحیح و مستند جغرافی معلومات نہ حاصل ہوں، آیات قرآنی کی تشریح، انگریزی مذاق والوں کے لئے، تشنہ رہے گی، مصر، عرب، شام، فلسطین، عراق (بابل) کم از کم اتنے مقامات کا تو تفصیلی جغرافیہ نظر میں ہونا ہی چاہئے۔ ورنہ یہ پتہ چل سکے گا کہ بنی اسرائیل کے لئے فرق بحر کہاں واقع ہوا تھا، اور نہ یہ کھل سکے گا کہ سبت شکنی کے مجرم یہود، کس مقام پر آباد تھے، اور اسی قبیل کے بیسیوں دوسرے مسائل۔

یہودی و مسیحی عقائد۔ نیز ان اقوام کی مفصل تاریخ و جغرافیہ، معاشرت اور اندرونی حالات پر کتب جوامع انگریزی میں نہایت مفصل موجود ہیں مثلاً (**Jewish Encyclopaedia**) جیوش انسائیکلوپیڈیا، جو علماء یہود کی لکھی ہوئی یہودیات و اسرائیلیات پر ایک جامع کتاب ۱۲ ضخیم مجلدات میں ہے۔ یا انسائیکلوپیڈیا بیبلیکا، متعدد جلدوں میں، یا ڈکشنری آف دی بائبل چار جلدوں میں، وقس علیٰ ہذا۔ اور ان کے علاوہ عام جوامع، مثلاً انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا، جو نہایت ضخیم ۲۸ - ۲۹ جلدوں میں ہے۔

۴- ان سب کے علاوہ قرآن و اسلام پر مخالفین نے "علم و تحقیق" کے نام سے جو کچھ لکھا ہے، اس سب کے پیش نظر رہنے کی بھی ضرورت ہے خصوصاً مرشفیلڈ، نولڈیکی، مارگولیس، میور وغیرہم کی تصانیف۔

۵- انگریز مستشرقین نے عربی صرف و نحو اور عربی لغت پر انگریزی میں جو کتابیں لکھی ہیں ان کا ذخیرہ بھی سامنے ہونا ضروری ہے۔ عربی صرف و نحو پر انگریزی میں متعدد اور ضخیم کتابیں ہیں۔ ہاول کی عربی انگریزی گرامر، ۷ یا ۸ جلدوں میں ہے، رائٹ کی عربی گرامر دو جلدوں میں۔ وقس علیٰ ہذا۔ عربی سے انگریزی کا لغت، مستند و مفصل صرف ایک ہی ہے۔ اور وہ لین کا (**Lexicon**) مد القاموس کے نام سے ہے جو گویا تاج العروس کا انگریزی خلاصہ ہے طویل و عریض ۸ ضخیم مجلدات میں ہے۔ اور اب کتب فروشوں کے ہاں ملتا بھی نہیں۔ ایک انگریزی لغت صرف الفاظ قرآن پر ہے، وہ متوسط ضخامت کا ایک جلد میں ہے لیکن اب ملنا بھی اس کا دشوار ہے۔

اتنے بڑے کتبخانہ کی فراہمی کھلی ہوئی بات ہے کہ مفت ہوجانی ممکن نہیں تخمینی رقم سینکڑوں سے گذر کر ہزاروں تک پہنچتی ہے۔ عقل اس گنج قارون کا نام سن کر سر گریباں، لیکن دل یہ کہہ رہا ہے، کہ جس نے ارادہ وہمت میں یہ قوت دیدی کیا وہ اس کے انتظام پر بھی قادر نہیں۔ وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ (وہ انسان کو ایسے ایسے ذرایع سے دیتا ہے، جو انسان کے خیال میں بھی نہیں ہوتے!) آخر اسی کا تو ارشاد ہے۔ ظاہری اسباب کے لحاظ سے اتبک صرف اتنا ہوا ہے کہ ایک باہمت اللہ کے بندے نے لین کا لغت ایک پبلک لائبریری سے نکلوا کر چند ماہ کے لئے مستعار بھیجدیا ہے۔ اور کتابوں کی فراہمی کے لئے بھی لکھنو کے ایک کریم فرمانے وعدہ فرمایا ہے لیکن انکے وعدہ کے ایفار کو کچھ ایسے تاخیر طلب مراحل سے ہو کر گزرنا ہے، کہ تریاق کو عراق سے لانے والی ضرب المثل یاد پڑجاتی ہے۔ ع۔

دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک!

حلقہ احباب میں کسی سے بھی خطاب خاص کی ہمت مطلق نہیں۔ اس خطاب عام کے لئے باللہ العظیم دل جھجکا رہا ہے۔ اتنا بھی جو لکھا جارہا ہے، بڑے تامل وتذبذب کے بعد، دو ایک مخلصین کی محض تعمیل ارشاد میں۔ بندوں سے امداد کی درخواست، جب ذوالقرنین جیسے ساز وسامان والے کو کرنی پڑی، اور کہنا پڑا کہ فَأَعِينُونِي بِقُوَّةٍ (میری مدد ہاتھ پیر سے کرو) تو ایک بے برگ ونواسگ دنیا، احباب کرام سے استغنار کا دعویٰ کسی درجہ میں بھی کس منہ سے کر سکتا ہے؟ تاہم بزرگوں کی ایک بات کان میں پڑی ہوئی ہے اسے سب حسن ظن رکھنے والے دوستوں تک پہونچا دینا ضروری ہے۔ وہ یہ کہ کار خیر میں شرکت کی پہلی شرط طیب خاطر وانشرح قلب ہے۔ طبیعت میں گرانی اور دل پر بار اگر کسی طرح کا بھی محسوس ہو، تو ہرگز قصد شرکت نہ فرمایا جائے۔ اور اس کا تو گمان بھی نہ لانا چاہئے کہ بیچ میں کوئی باقاعدہ فہرست چندے کی کھلے گی، یا نام بنام چندہ دینے والوں کا اعلان کیا جائیگا، یا عطیات کے حساب کتاب کا

رجسٹر رکھنے اور بہی کھاتے کھولنے کی مزید مشغولیت مول لی جائے گی۔

جھجھک کی سب سے بڑی وجہ خود اپنے اندر کی کمزوریاں ہیں۔ کام سالہا سال کا ہے۔ زندگی اور صحت کا بھروسہ پل بھر کا نہیں، چہ جائیکہ سالہا سال کے کام کے لئے! پھر بشری ارادہ میں ضعف و اضمحلال خدا جانے کتنے مختلف و متعدد اسباب سے پیدا ہوتا رہتا ہے۔ آیندہ کی پیش بینی کون کر سکتا ہے۔ کسے خبر کل کیا کیا حوادث اور کیسے کیسے اتفاقات پیش آجائیں۔ اگر خدا نخواستہ کوئی سو اتفاق پیش آگیا، تو اس وقت کی ندامت کا کیا ٹھکانا ہو سکتا ہے! شرکت کی اجازت اس لئے بھی صرف اُن حضرات کے لئے ہے جن کا قلب بہر صورت حال کے لئے بخوشی راضی ہو۔

اپریل اور مے کے دو مہینے علالت کی نذر ہوئے، متعدد امراض جمع ہو گئے تھے، جن میں سب سے زیادہ خطرناک ضغطہ قلب تھا، نیا کام اس دوران میں بالکل رکا رہا، علالت کا اثر اب تک ہے، اور کام بھی بہت سست رفتاری سے ہو رہا ہے۔ پارہ اول نظر ثانی کے بعد ٹائپ ہو چکا ہے، اور ملک کے مختلف اہل الرائے حضرات کے پاس مشورہ و اصلاح کے لئے گیا ہوا ہے۔ مثلاً مولوی نواب علی صاحب ایم اے (صاحب صحف سماوی و سیرۃ رسول اللہ وغیرہ) سابق پروفیسر بڑودہ کالج، حال وزیر تعلیمات، ریاست جوناگڈھ۔ پارۂ اوّل کو بعض علمائے اہل سنت سے مشورہ کے لئے اردو میں بھی منتقل کر دیا گیا ہے، اور اس کی نقلیں حضرت مولانا اشرف علی تھانوی مدظلہ، مولٰنا سید سلیمان صاحب ندوی اور مولٰنا مناظر حسن صاحب گیلانی وغیرہم کی خدمت میں روانہ ہو رہی ہیں۔

تبدیل جلود

از

مولنا عبداللہ العمادی

۱

بعض وقت سیدھی سی بات میں اخلاق اور پیچیدگی پیدا ہو جاتی ہے قرآن کریم میں ایک مقام پر انسان کی کھالوں پر عذاب ہونے کا تذکرہ ہے۔ صورت یوں بتائی ہے کہ خدا کی نشانیوں کا جو انکار کرتے ہیں وہ عنقریب آتش دوزخ میں داخل کئے جائیں گے۔ وہاں جب آگ کی وجہ سے ان کی کھالیں پک کر گل جائیں گی تو خدا کے حکم سے دوسری کھالیں تبدیل ہو جائیں گی۔ غرض یہ ہے کہ عذاب میں مبتلا رہیں اور اس کا سلسلہ ٹوٹنے نہ پائے۔

یہ مضمون سورۂ نساء میں مذکور ہے اور بظاہر ایک سلجھی ہوی بات ہے لیکن وقت آفرینی و عجائب پسندی کی بنیاد پر جو شاخیں نکلیں جیسے جیسے شگوفے پھوٹے اور تفسیروں میں جب نہج پر اس قسم کی روایتیں پھیلیں اُن کے نظارے عجیب۔ مثلاً:-

(الف) دوزخیوں کی جب ایک کھال پک کر گل جائے گی تو دوسری کھلڑی جو چڑھیگی اُس کا رنگ سفید کاغذ جیسا ہوگا۔ [۱]

(ب) کھال چالیس گز کی ہوگی۔ دانت ستر گز کے اور شکم اتنا فراخ ہوگا کہ ایک پہاڑ اس میں

---

[۱] قال ابن جریر حدثنا ابن حمید قال حدثنا جریر عن للاعمش عن ثویر عن ابن عمر قال اذا احترقت جلودہم بدلناہم جلودا بیضا امثال القراطیس۔

سما جائے۔[1]

(ج) دن بھر میں ستر ستر مرتبہ کھال گل جایا کرے گی اور نئی کھال چڑھا کرے گی۔[2]

(د) روزانہ ستر ہزار کھالیں آگ سے جل جایا کریں گی۔ ہر کھال چالیس گز کی موٹی ہوگی۔[3]

(ھ) دن میں سو سو مرتبہ نئی کھالیں بدلی جائیں گی۔[4]

(و) آگ ان کھالوں کو روزانہ ستر ستر ہزار مرتبہ کھا جایا کرے گی۔ اور ہر مرتبہ از سر نو کھال جمے گی۔[5]

(ز) اور جسم اتنا لانبا چوڑا کر دیا جائے گا کہ ایک تیز رفتار سوار کے لئے دونوں مونڈھوں کے بیچ میں تین دن کی مسافت ہوگی۔[6]

(ح) دانت کوہ اُحد جتنے بڑے ہوں گے۔ اور جسم کا موٹاپا تین دن کی مسافت کے برابر ہوگا۔[7]

(ط) نئی کھال جو پیدا ہوگی وہ دوزخیوں کے گوشت ہی سے بنے گی۔[8]

(ی) کھال جو بدلی جائے گی وہ اصل میں ذات کی تبدیلی ہوگی۔[9]

(۲)

ان روایتوں پر خود مفسرین نے اعتراض کئے ہیں اور بات بنانے کے لئے پھر جواب دینے کی کوشش

---

[1] عن المثنیٰ عن اسحاق عن ابن ابی جعفر عن ابیہ عن الربیع قال الخ۔
[2] عن المثنیٰ عن سوید بن نصر عن ابن المبارک قال بلغنی عن الحسن الخ۔
[3] عن القاسم عن الحسن عن ابی عبیدۃ التمداد عن ہشام بن حسان عن الحسن۔
[4] زعم ابو السعود العمادی ان ہذہ الآیۃ قرأت عند عمرؓ فقال معاذ بن جبل عندی تفسیرہا یبدل فی ساعۃ مائۃ مرۃ۔
[5] قال الحسن تاکلہم النار کل یوم سبعین مرۃ (ابو السعود)۔
[6] من مزاعم ابی السعود عن ابی ہریرۃ۔
[7] ابو السعود عن ابی ہریرۃ۔
[8] قال السدی ان اللہ تعالیٰ یبدل الجلود من لحم الکافر فیخرج من لحمہ جلداً آخر (رازی)
[9] قال النیسابوری جزم صاحب الکشاف بان المراد من ہذا التبدیل ہو تغییر الذات فلہذا فسر التبدیل بالابدال (زمخشری و نیسابوری)۔

بھی کی ہے ۔ علامہ ابن جریر طبری فرماتے ہیں ۔

مامعنی قوله جل ثناؤه کلما نضجت جلودهم بدلنا جلوداً غیرها وهل یجوز ان یبدلوا جلوداً غیر جلودهم التی کانت لهم فی الدنیا فیعذبوا فیها؟ فان جاز ذالك فاجز ان یبدلوا اجساماً وارواحاً غیر اجسامهم وارواحهم التی کانت لهم فی الدنیا فتعذب وان اجزت ذالك لزمك ان یکون المعذبون فی الاخرة بالنار غیر الذین اوعدهم الله العقاب علی کفرهم به ومعصیتهم ایاه وان یکون الکفار قد ارتفع عنهم العذاب ۔ [1]

اللہ تعالیٰ کے اس قول کا کیا مطلب ہے کہ "جب ان (منکروں) کی کھالیں پک کر گل اٹھیں گی تو ہم ان کے علاوہ دوسری کھالیں بدل دیں گے" کیا یہ جائز ہے کہ ان کھالوں کے علاوہ جو دنیا میں رہی تھیں دوسری کھالیں بدل جائیں اور ان میں عذاب ہو۔ یہ اگر جائز ہے تو جہاں نئی کھالوں پر عذاب ہونیکا جواز تسلیم ہوا ہے ۔ یہ بھی جائز مان لو کہ دنیا میں جو روحیں اور جسم تھے وہ بھی بدل جائیں گے اور تبدیل شدہ (نئے) اجسام و ارواح پر عذاب ہوگا ۔ یہ بات اگر جائز ٹھیری تو تم کو لازمی طور پر ماننا پڑیگا کہ آخرت میں آگ کا عذاب جن لوگوں پر ہوگا وہ ان لوگوں کے علاوہ ہوں گے جن کے انکار و نافرمانی پر خدا نے انھیں عذاب کی دھمکی دی تھی کافروں سے عذاب اٹھ جائے گا ۔ [1]

پھر لکھتے ہیں :۔

اماجلود اهل الکفر من اهل النار فانها لا تحرق لان فی احتراقها الی

دوزخی کافروں کی کھالیں جل نہ جائیں گی اس لئے کہ جل جانے کا تو یہ مطلب ہوا کہ وہ فنا ہو جائینگی ۔

[1] تفسیر ابن جریر جلد ۵ صفحہ ۸۴

حال اعادتها فناؤها وفي فنائها راحتها
قالوا وقد اخبر الله تعالىٰ ذكره عنها
انهم لا يموتون و يخفف عنهم من
عذابها. قالوا وجلود الكفار احد
اجسامهم ولو جاز ان يحترق منها
شيءٌ فيفنى ثم يعاد بعد الفناء في النار
جاز ذلك في جميع اجزائها واذا جاز
ذلك وجب ان يكون جائزاً عليهم
الفناء ثم الاعادة والموت ثم الاحياء
وقد اخبر الله عنهم لا يموتون قالوا
وفي خبره عنهم انهم لا يموتون
دليل واضح انه لا يموت شيءٌ من
اجزاء اجسامهم والجلود احد
تلك الاجزاء۔ [1]

اور ظاہر ہے کہ فنا ہونے میں ان کے لئے راحت و آسائش ہے اللہ تعالیٰ اس باب میں خبر دے چکا ہے کہ دوزخی نہ تو مریں گے اور نہ ان کے عذاب میں تخفیف ہوگی کافروں کی کھالیں ان کے جسم ہی کی ایک جز ہیں جسم کا کوئی جز اگر جل کر فنا ہو جائے اور پھر فنا ہونے کے بعد آگ ہی میں اس کا اعادہ بھی ہو تو ایک جز میں اس کیفیت کو جائز ماننے سے یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہی کیفیت تمام اجزا کے لئے بھی جائز ہے یعنی ہر جزو بدن اور پورے جسم کا یہی حال ہو سکتا ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ دوزخیوں کے جسم کا فنا ہو جانا۔ پھر از سر نو پیدا ہونا۔ مرنا اور پھر زندہ ہو جانا جائز ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ خبر دے چکا ہے کہ دوزخیوں کو موت نہ آئے گی اور یہ ایک کھلی ہوئی دلیل اس دعوے کی ہے کہ ان کے جسم کے کسی جز پر موت لاحق نہ ہوگی۔ اور یہ مانی ہوئی بات ہے۔ کہ کھال جسم کا ایک جز ہے [1]

یہ اعتراضات معترضین کی زبان سے ادا کئے گئے ہیں اور جواب بھی خود اپنی طرف سے نہیں دیا ہے مفسرین کے تین جواب نقل کر دیے ہیں مگر لہجہ سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ان میں کسی پر اطمینان نہیں ہے [2]۔ ان جوابوں کا خلاصہ حسب ذیل ہے:۔

[1] تفسیر ابن جریر جلد ۵ صفحہ ۸۵۔
[2] ۔ جواب کی ابتدا "قیل" سے کی ہے۔ جو تضعیف و تمریض کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ یعنی استدلال کے وثوق و اعتماد میں ضعف و کمزوری دخیل ہے۔

الف۔ دوزخ کا عذاب دراصل انسان کے لئے ہے۔ گوشت و پوست کے لئے نہیں ہے۔ جلنے کو جلد (کھلڑی) بھی جلے گی۔ لیکن مدعا خود انسان کا جلنا ہے جو گوشت و پوست سے بالکل ایک علیٰحدہ چیز ہے۔ بار بار نئی کھلڑی اس لئے پیدا ہوگی کہ اس کے جلنے سے انسان کو تکلیف پہنچتی رہے اور سلسلۂ عذاب منقطع نہ ہونے پائے رنج و راحت کا احساس نفس کو ہوتا ہے۔ گوشت و پوست کو نہیں ہوتا گوشت و پوست کا عذاب اصل میں عذاب نفس کا ایک ذریعہ ہے۔ اور یہ ایک ایسا واضح اور کھلا ہوا مسئلہ ہے جس کی واقعیت میں کسی فہمیدہ شخص کو کسی قسم کا اشتباہ نہیں ہوسکتا۔

ب۔ گوشت و پوست میں بھی آسایش و تکلیف کے محسوس کرنے کا مادّہ موجود ہے جسم کے کسی عضو میں درد ہوتا ہے تو سارے بدن پر اُس کا اثر پڑتا ہے۔ دوزخیوں کے گوشت و پوست کے جل جانے اور پھر نئے گوشت و پوست کے پیدا کرنے کا یہی منشا ہے۔

ج۔ دوزخیوں کے لئے نئی نئی کھلڑی بدلنے کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ واقع میں نیا گوشت و پوست ہر گھڑی پیدا ہوتا رہے گا۔ بلکہ جیسا کہ قرآن کریم نے ایک اور مقام پر بیان کیا ہے کہ:۔

وَتَرَى الْمُجْرِمِينَ يَوْمَئِذٍ مُّقَرَّنِينَ فِي الْأَصْفَادِ سَرَابِيلُهُم مِّن قَطِرَانٍ وَتَغْشَىٰ وُجُوهَهُمُ النَّارُ لِيَجْزِيَ اللَّهُ كُلَّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ إِنَّ اللَّهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ۔ (سورۂ ابراہیم ۱۴۔ رکوع ۷۔ آیت ۵۱)	تم اس روز گنہگاروں کو زنجیروں میں جکڑے ہوئے دیکھو گے۔ ان کے کرتے گندھک کے ہوں گے۔ آگ ان کے مونہوں کو ڈھانک لے گی۔ غرض یہ ہے کہ جس نے جو کمائی کی ہے اللہ اس کی جزا دے۔ درحقیقت اللہ جلد حساب لینے والا ہے۔

یہاں بھی اس کے مطابق دوزخیوں کے کرتے جو گندھک کے ہونے کی وجہ سے بہت زیادہ اشتعال پذیر ہوں گے جب جب جل چکیں گے تو دوسرے کرتے بدل دئے جائیں گے یعنی کھال کی تبدیلی سے تبدیل لباس مراد ہے۔

۳

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ۔ (۱) اگر احساس کا مادّہ محض انسان کے نفس میں ہے ۔گوشت و پوست میں نہیں ہے ۔اور نفس ہی پر عذاب کرنے کے لئے گوشت و پوست کو بھی جلایا جائے گا۔ تو کیا یہ ممکن نہ تھا کہ براہ راست نفس پر عذاب ہوتا اور وہ اجزائے جسم جن میں احساس ہی نہیں ہے ۔اور اس لئے اگر عذاب بھی ہو تو ان پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا اس لپیٹ میں نہ آتے ۔جب کسی چیز میں عذاب کی حس ہی نہیں تو خواہ مخواہ کو اُسے چھیڑنے یا ستانے سے کیا فائدہ ہو سکتا ہے ۔

۲ ۔خالی گوشت و پوست میں بھی اگر احساس ہے تو گوشت کا وہ پارچہ اور کھلڑی کا وہ جز جو بدن سے جُدا ہو چکا ہو یہ احساس اس میں کیوں نہیں ہے ۔

۳ ۔تبدیل جلد سے اگر تبدیل لباس مراد ہے اور پہلے لباس ہی کے جلنے کے بعد اہل دوزخ کو نیا لباس تبدیل کرایا جائے گا۔ تو اس کے لئے آیت میں لفظ "نُضِجَ" کا استعمال جس کے معنی پکنے اور پک کر گل جانے کے ہیں ۔کیوں کر جائز ہو سکتا ہے ۔عربی زبان میں جب یہ محاورہ ہی نہیں ہے تو قرآن کریم کی بلاغت اس کو کب روا رکھنے لگی تھی ؟

اس موقع پر امام رازی نے بھی دو اعتراض پیدا کئے ہیں ۔

الف خدا میں جب اس قدر قدرت ہے کہ دوزخیوں کو ہمیشہ آگ میں زندہ رکھ سکتا ہے ۔تو کیا وہ اُن کے جسم کے باقی رکھنے پر قادر نہ تھا کہ عذاب بھی ہوا کرتا اجزائے جسم بھی فنا نہ ہوتے اور نئے گوشت و پوست کے چڑھانے کی ضرورت بھی نہ پڑتی ؟

ب ۔جس گوشت و پوست نے گناہ کئے تھے ۔جب وہ آگ میں جل چکا تو نئے گوشت و پوست کو جو بالکل بے گناہ ہیں ۔پیدا کر کے آگ میں جلانا صریح بے انصافی ہے ۔

پہلے اعتراض کے جواب میں لکھتے ہیں :۔

انه تعالیٰ لا یُسئال عما یفعل بَلْ	خدا جو چاہے کرے اس سے کوئی باز پرس نہیں ہم تو یہ
نقول انه تعالیٰ قادرٌ علے ان یوصل	بھی کہہ سکتے ہیں کہ دوزخیوں کے جسم کو بغیر اس کے کہ آگ
الی ابدا نھم الاماً عظیمةً من غیر	میں ڈالنا پڑے۔ خدا سخت سے سخت عذاب دے سکتا ہے۔
ادخال النار مع انهٗ ادخلھم النارؔ	مگر اس پر بھی اس نے آگ میں ڈالا۔ [1]

دوسرے اعتراض کے حسب ذیل جواب دیئے ہیں۔

الف۔ نضج اور نضیج یہ دونوں دو چیزیں ہیں۔ اس لئے ذات کے اعتبار سے جسم تو وہی رہیگا جو دنیا میں تھا۔ البتہ صفت بدلی ہوگی۔

ب۔ عذاب اصل میں انسان پر ہوگا اور ظاہر ہے کہ کھال انسان کی ماہیت میں داخل نہیں ہے بلکہ اس سے ملی ہوئی ایک زائد چیز ہے۔ نئی کھال انسان تک عذاب پہونچنے کا ایک ذریعہ ہوگی۔ اس لئے حقیقت میں عذاب اسی کو ہوا جس نے گناہ کئے تھے۔

ج۔ کھال سے مراد گندھک کے کرتے ہیں۔

د۔ اس سے حقیقت مراد نہیں ہے بلکہ استعارہ مقصود ہے۔

ھ۔ دوزخیوں کے جسم پر نئی کھال جو پیدا ہوگی وہ انھیں کے گوشت سے بنی ہوگی اور ظاہر ہے کہ ارتکاب گناہ میں یہ گوشت بھی شریک رہ چکا ہے۔

ہنوز یہ شبہہ باقی رہتا ہے کہ (ا) بے شبہہ خدا سے کوئی باز پرس نہیں کر سکتا لیکن کیا اس کی تمام باتیں حکمت پر مبنی نہیں۔ کیا ایک نیا شبہہ پیدا کر دینے سے پہلے شبہہ کی اہمیت کم ہو جاتی ہے۔ اور کیا خود امام صاحب نے ایک موقع پر یہ نہیں لکھا ہے کہ آتش دوزخ سے وہ آگ مراد نہیں ہے جس میں کیمیاوی مادے ہوا کرتے ہیں

[1] یہ اور اس سے قبل کے دونوں اعتراض اور بعد کے پانچوں جواب تفسیر کبیر میں بڑی تفصیل سے مذکور ہیں ملاحظہ ہو جلد ۳ صفحہ ۲۳۱ طبع خیریہ مصر ۱۳۰۸ھ۔

۲۔ تبدیلی خواہ جسم میں ہوئی ہو یا اس کی صفت میں۔ سوال تو یہ ہے۔ کہ مجرم خود انسان تھا۔ اور وہی صاحب ارادہ بھی ہے گوشت و پوست میں یہ مادہ کہاں کہ اپنے ارادہ سے کوئی کام کر سکیں! انسان کی طبیعت نے جب اپنی مرضی کے مطابق جیسا چاہا ان سے کام لیا اور وہ انسانی اغراض کے حاصل ہونے میں محض آلہ ہی آلہ تھے! اس صورت میں عذاب کا مستحق اگر ہے تو انسان کا نفس ہے۔ کھال نے کیا گناہ کیا تھا کہ اس کو بار بار جلایا جائے۔ یہ عذاب اگر محض اس بنا پر ہے کہ جرم کے وقت کھال بھی جسم انسانی کے شریک حال تھی۔ تو اس ضابطہ کی رو سے اس حصۂ زمین کو بھی جس پر جرم ہوا ہو اور اس کپڑے کو بھی جو حالت جرم میں مجرم کے جسم پر رہا ہو عذاب دینا چاہئے۔

۳۔ استعارہ کی توجیہ قرین قیاس تو ہے۔ مگر اس کا ثبوت درکار ہے۔

۴۔ مفسر سُدّی کی یہ رائے کہ "دوزخیوں کے جسم پر نئی کھال جو پیدا ہوگی وہ انہیں کے گوشت سے بنی ہوگی۔ اس لئے یہ اعتراض نہ ہونا چاہئے کہ نئی کھال پر جو کسی حالت میں شریک گناہ نہ تھی۔ کیوں عذاب ہوا" ایک ایسی رائے ہے جو اسی وقت قابل تسلیم ہو سکتی ہے۔ جب یہ بھی ثابت ہوجائے کہ سورۂ اعراف میں سوئی کے ناکے سے اونٹ کے گذر جانے کی قرآن نے جو شرط کی ہے وہ خدا کے نزدیک محال ہو تو ہو۔ مگر واقع میں محال نہیں ہے۔ جسم خواہ کتنا ہی لانبا چوڑا کیوں نہ ہو تاہم اس کی ایک انتہا ہوتی ہے۔ گوشت سے اگر ہمیشہ کھال بنا کی اور ایک کے جل جانے کے بعد دوسری پیدا ہوتی رہی تو ایک نہ ایک دن ایسا بھی آئے گا، کہ سارا جسم خود بخود فنا ہو جائے گا۔ اور عذاب جاوید کی نوبت ہی نہ آنے پائے گی۔

۵۔ طبی تحقیقات نے ثابت کر رکھا ہے کہ اجزائے بدن تحلیل ہوا کرتے ہیں۔ پرانے اجزا کی جگہ نئے اجزا لیتے رہتے ہیں۔ اور اس طرح ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جبکہ وہ جسم جس کو لیکر انسان پیدا ہوا تھا ہمہ تن بدل چکا ہوتا ہے۔ فرض کرو کسی شخص نے ابتدائی زندگی میں کوئی ایسا گناہ کیا تھا جس کی پاداش میں دوزخ نصیب ہو۔ اور آگ میں جلنا پڑے۔ سوال یہ ہے کہ وہ اجزائے جسم جن کے ذریعہ سے ارتکاب گناہ کا ان کو

موقع ملتا تھا ۔ جب وہ حالت زندگی ہی میں تحلیل ہو چکے تھے اور پیرانہ سری کے عالم میں نئے اجزا نے جن کو ابتدائی عمر کی غلط کاریوں سے سابقہ ہی نہیں پڑا تھا پرانے اجزا کی جگہ لے لی تھی ۔ تو آخر کس جرم کی پاداش میں ان کو جلایا جائے گا ۔

عراق عرب کے مشہور مفسر شہاب آلوسی کی رائے اس موقع پر سننے کے قابل ہے ۔ فرماتے ہیں :۔

عندی ان هذا السوال مما لا یکاد یسأله عاقل فضلاً عن فاضلٍ و ذلک لانّ عصیان الجلد وطاعته وتألمه وتلذذه غیر معقول لانه من حیث ذاته لا فرق بینه وبینَ سائر الجمادات من جهة عدم الادراک والشعور وهو اشبه الاشیاء بالالة فید قاتل النفس ظلماً مثلاً الة له کالسَّیف الذی قتل به ولا فرق بینهما الا بان الید حاملة للروح والسیف لیس کذالک وهذا لا یصلح وحده سبباً لاعادة الید بذاتها واحراقها دون اعادة السَّیف و احراقه لان ذالک الحمل غیر اختیاری

میرے نزدیک یہ سوال ایسا نہیں ہے جسے کوئی صاحب فضل و کمال تو کیا کوئی معمولی عقل کا آدمی بھی کر سکے سبب یہ ہے کہ کھال کی نافرمانی ۔ اطاعت ۔ الم پذیری اور لذت یاب ہونا یہ سب نامعقول باتیں ہیں اس لئے کہ ذاتی حیثیت سے اس میں اور دوسرے جمادات میں کوئی فرق نہیں ہے احساس و ادراک و شعور نہ اُن میں ہے اور نہ اس میں ۔ آلے سے وہ بہت زیادہ ملتی جلتی ہے ۔ مثلاً جس شخص نے کسی کو بے گناہ قتل کیا ہو اس کا ہاتھ بھی آلۂ قتل ہے اور اسی تلوار کے مشابہ ہے جس سے مقتول کی اس نے جان لی تھی ان دونوں میں بجز اس کے اور کوئی فرق نہیں ہے کہ ہاتھ میں جان ہے اور تلوار میں نہیں ہے لیکن یہ کوئی ایسی بات نہیں جس کی بنا پر ہاتھ کو پھر پیدا کر کے جلایا جائے ۔ اور تلوار اس سے مستثنیٰ رہے ۔ سبب یہ ہے کہ یہ بے اختیاری

فالحق ان العذاب على النفس الحساسة بای بدن حلت وفی ای جسد کانت وکذا ایقال فی النعیم۔ ۱

کی بات تھی۔ لہذا حق یہ ہے کہ عذاب اس نفس پر ہوگا جس میں حس ہے۔ خواہ وہ کسی بدن میں جائے اور کسی جسم میں رہے یہی حالت بہشت کی نعمتوں کی بھی ہے۔ ۱

اس کے بعد متعدد حدیثیں تائید میں روایت کی ہیں۔ اور پھر لکھتے ہیں۔

ولولا ما علم من الدين بالضرورة من المعاد الجسمانی بحیث صار انکاره کفراً لم یبعد عقلاً القول بالنعیم والعذاب الروحانیین فقط ولما توقف الامر على اثبات الاجسام فعلاً ولا یتوهم من هذا انی اقول باستحالة اعادة المعدوم معاذ الله تعالى ولکنی اقول بعدم الحاجة الى اعادته وان امکنت۔ والنصوص فی هذا الباب متعارضة فمنها ما یدل على اعادة الاجسام بعینها بعد اعدامها ومنها ما یدل على خلق مثلها وفناء الاولى ولا ارى بأساً بعد القول بالمعاد الجسمانی فی اعتقاد ای الامرین

مذہب کے رو سے اگر بدیہی طور پر یہ بات معلوم نہ ہوتی کہ جسم کے لئے معاد لازمی ہے اور اس کا انکار حد کفر تک پہنچتا ہے تو عقل کے رو سے یہ بات کوئی دور نہ تھی کہ راحت و عذاب دونوں روحانی ہوں گے اس لئے کہ بالفعل جسم کا ثبوت دینے پر معاملہ موقوف ہے۔ یہ شبہ نہ ہونا چاہئے کہ جو چیز معدوم ہو چکی ہو اس کے اعادہ کو میں محال کہہ رہا ہوں معاذ اللہ لیکن میں یہ البتہ کہتا ہوں کہ وہ جسم جو معدوم ہو چکا ہو اس کا واپس لانا خواہ ممکن ہو مگر اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ حدیثیں بھی اس باب میں ایک دوسرے کے معارض ہیں بعض سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ جسم کے معدوم ہو جانے پر بعینہ اسی جسم کا اعادہ ہوگا اور بعض کا یہ مفہوم ہے کہ پہلا جسم تو فنا ہو چکا ہے مگر ویسا ہی دوسرا جسم پیدا ہو جائے گا جب معاد جسمانی ہی کو ماننا ہے تو کچھ

۱ تفسیر روح المعانی سورۂ نساء

مضایقہ نہیں کہ ان میں سے جس بات کو چاہیں مان لیں۔[۵]

(۵)

اس موقع پر ناظرین آیت زیر بحث کو بھی ملاحظہ فرمائیں۔ سورۂ نساء میں ہے:۔

اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا بِاٰیٰتِنَا سَوْفَ نُصْلِیْهِمْ نَارًا ۔ کُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَیْرَهَا لِیَذُوْقُوا الْعَذَابَ اِنَّ اللّٰهَ کَانَ عَزِیْزًا حَکِیْمًا ۝ (سورۂ ۴ رکوع ۸ آیت ۵۹)	جن لوگوں نے ہماری نشانیوں سے انکار کیا ہم ان کو آگ میں (لے جا) داخل کریں گے جب انکی کھالیں گل جائیں گی تو ہم اس غرض سے کہ وہ عذاب کا مزہ چکھیں۔ گلی ہوئی کھالوں کی جگہ دوسری کھالیں بدل دیں گے۔ بیشک اللہ (بڑا) زبردست صاحب تدبیر ہے

آیت کا مطلب بیان کرنے سے پہلے دو باتیں بطور اصول کے سن لینی چاہئیں:۔

الف۔ قرآن کریم نے عذاب آخرت کی جو تشریحیں کی ہیں اُس کی صورتیں زیادہ تر انسان کی اخلاقی کمزوریوں سے وابستہ ہیں۔ امام غزالی لکھتے ہیں۔

سر قوله تعالیٰ کَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْیَقِیْنِ لَتَرَوُنَّ الْجَحِیْمَ ای ان الجحیم فی باطنکم فاطلبوها بعلم الیقین لتروها قبل ان تدرکوها بعین الیقین [۱]	اللہ تعالیٰ کے اس قول کا کہ "ہرگز نہیں اگر علم الیقین ہوتا تو دوزخ کو تم دیکھ لئے ہوتے" راز یہ ہے کہ دوزخ خود تمہارے دل میں موجود ہے۔ لہٰذا اس کو علم یقین کے ذریعہ سے دیکھ لو قبل اس کے کہ یقین کی آنکھ سے اُس کو دیکھو گے [۱]

ب۔ بہشت و دوزخ کے متعلق قرآن کریم میں جس قدر واقعات مذکور ہیں اُن سب میں مجاز کا پہلو ہے۔ علامہ ابن تیمیہ فرماتے ہیں۔

[۵] عذاب روحانی ہوگا یا جسمانی اور اعادۂ معدوم جائز ہے یا نہیں یہ ایک جداگانہ بحث ہے اور کسی مستقل عنوان کے تحت میں اس پر گفتگو ہو سکتی ہے۔ [۱] جواہر القرآن۔

إنّ الله سبحانه وتعالى اخبرنا بما وعدنا به في الدار الآخرة من النعيم والعذاب واخبرنا بما يوكل ويشرب وينكح ويفرش وغير ذلك فلولا معرفتنا بما يشبه ذلك في الدنيا لم نفهم ما وعدنا به ونحن نعلم مع ذلك ان تلك الحقائق ليست مثل هذه حتى قال ابن عباس رضي ليس في الدنيا مما في الجنة الا الاسماء

خدا نے آخرت میں جس راحت و عذاب کا ہم سے وعدہ کیا ہے۔ اس کی خبر اور نیز اُن چیزوں کی خبر دی جو کھائی پی صحبت کی۔ اور بچھائی جاتی ہیں وغیرہ وغیرہ لہٰذا جن چیزوں کا وعدہ ہوا ہے۔ اگر دنیا میں بھی ان سے ملتی جلتی ہوی چیزوں کا ہم کو علم نہوتا تو ہم اُن وعدوں کو سمجھ سکتے ہی نہ تھے۔ باایں ہمہ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ یہ واقعات (جو بہشت و دوزخ کے متعلق قرآن کریم میں مذکور ہیں) ایسے ہی نہیں ہیں۔ (جیسے دنیا میں نظر آتے ہیں) حتیٰ کہ حضرت ابن عباس کا قول ہے کہ

"بہشت میں جو چیزیں ہیں اُن سے دنیا میں کوئی چیز بھی نہیں ہے اگر ہے تو صرف نام ہے" لہ

یہ اصولی ایضاح کسی مزید تشریح کی محتاج نہیں ہے اور اب اس کے بعد آیت زیر بحث کی تفسیر کے لئے امام رازی کے اس فقرہ کو درج کر دینے میں کوئی مضایقہ نہیں ہے جو ان کی رائے میں واقع ہو یا نہو مگر ممکن ضرور ہے لکھتے ہیں۔

يمكن ان يقال هذا استعارة عن الدوام وعدم الانقطاع كما يقال لمن يراد وصفه بالدوام كلما انتهى فقد ابتدأ من اوله فكذا قوله

کہہ سکتے ہیں کہ آیت میں عذاب کے ہمیشہ رہنے اور منقطع نہ ہونے کی جانب اشارہ ہے جس طرح اس شخص کی نسبت جس کی مداومت کی تعریف مقصود ہوتی ہے کہتے ہیں کہ "جب وہ ختم کر چکتا ہے تو پھر شروع کر دیتا ہے اور جب آخر تک پہونچتا ہے تو پھر اول سے ابتدا

كلما نضجت جلودهم بدلناهم

لہ رسالہ فی شرح حدیث النزول ۔

جُلُوْدًا غَيْرَهَا۔ یعنی کلما ظنوا انهم نضجوا واحترقوا وانتهوا الى الهلاك اعطيناهم قوة جديدة من الحياة بحيث ظنوا انهم الآن حدثوا ووجدوا فيكون المقصود بيان دوام العذاب وعدم انقطاعه[1]

کرتاہے" اسی مضمون کی یہ آیت بھی ہے کہ "ان کی یعنی دوزخیوں کی کھالیں جب گل جائیں گی تو ہم بجائے ان کے دوسری کھالیں بدل دیں گے" یعنی جب وہ سمجھیں گے کہ اب تو کھال پک کر جل چکی اور ہلاکت کا موقع آگیا کیونکہ وہ اسی کو غنیمت سمجھیں گے کہ بلا سے گوشت جل جائے کہیں اس عذاب کی زندگی سے نجات ملے، تو ہم از سرِ نو انہیں زندگی کی ایسی طاقت عطا کریں گے کہ اُن کو گمان ہوگا کہ ہم ابھی پیدا ہوئے ہیں۔ لہٰذا آیت کی غرض یہ ہوگی کہ عذاب جاوید کا تذکرہ کیا جائے اور اس کے مسلسل قائم رہنے کی توضیح

علامہ نظام الدین الحسن بن محمد بن الحسین القمی النیسابوری فرماتے ہیں۔

المراد الدوام وعدم الانقطاع ولا نضج ولا احتراق۔[2]

نہ کھال کا پک کر گلجانا مقصود ہے اور نہ جلنا مراد ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ سلسلہ عذاب ہمیشہ رہیگا اور منقطع نہ ہوگا۔

(۶)

شیخ اکبرؒ ابن عربی اندلسی نے ایک اور ہی معنی بیان کئے ہیں، فرماتے ہیں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا "اى حجبوا عن تجليات صفاتنا وافعالنا اذ مطلع الاية كونه متجليا بالعلم والحكمة والملك فى آل ابراهيم" سوف نصليهم" نار شوق الكمال لاقتضاء

"جن لوگوں نے ہماری آیتوں سے انکار کیا"، اس کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اللہ کے تجلیات صفات و تجلیات افعال سے حجاب میں رہے۔ یہ مطلب اس لئے ہے کہ اس آیت سے پہلے کی آیت میں "آتینا آل ابراہیم الکتاب والحکمۃ و آتیناہم ملکاً عظیماً"، وارد ہے یعنی آل ابراہیم کو اللہ

[1] تفسیر کبیر جلد ۲ صفحہ ۲۲۳۔ [2] تفسیر نیسا پوری جلد ۵ صفحہ ۱

غرائزهم وطلبا يعهم بحسب استعدادهم
ذلك مع رسوخ الحجاب ق
لذ ومه او نار قهر من تجليات
صفات قهره تناسب احوالهم او
نار شره نفوسهم وحدة شوقها
وطلبها لما ضربت بها من كمالات
صفاتها وشهواتها مع حرمانها
عنها۔

نے کتاب وحکمت وملک عظیم سے سرافراز فرمایا'
لہذا مطلع آیت یہ ہے کہ آل ابراہیم پر اللہ نے علم و
حکمت وملک کی تجلی نازل فرمائی' اس تجلی الٰہی کے
بعد بھی جن لوگوں نے کفر کیا "عنقریب ہم انھیں
آگ میں ڈالیں گے" یہ آگ کئی طرح کی ہوگی۔ (۱) شوق
کمال کی آگ باعتبار طبیعت و استعداد فطرت، کہ
آیات کے انکار سے حجاب میں پڑے ہیں' پردہ حائل
ہے، اور اب دل میں آگ لگی ہے کہ یہ کمی پوری ہوجائے
(۲) آتش قہر جو صفات قہر الٰہی کی ایک تجلی ہے۔ (۳) آتش حرص وطمع نفسانی کی حدت شوق و
طلب میں دل جل رہا ہے، محروم پڑے ہیں۔ اور اس محرومی کے دور کرنے کے لئے بے تاب
ہو رہے ہیں۔

كلما نضجت جلودهم رفعت حجبهم
الجسمانية بانسلاخهم عنها وبدلناهم
حجبا غيرها جديدة۔
"ليذوقوا العذاب" نيران الحرمان۔
ان الله كان عزيزا" قويا يقهرهم
ويذلهم بذل صفات نفوسهم
ويحرقهم بنيران توقانها الى
كمالاتهم مع حرمانهم ابدا" انتهى

"جب جب ان کی جلدیں پک کے گل سڑ گئیں" یعنی
جہاں ان کے جسمانی حجاب اٹھے اور وہ اس سے
باہر نکلنے کو ہوئے کہ دوسرے نئے نئے حجاب "ہم نے بدل دیے"
تاکہ آتش حرمان کا "عذاب چکھیں"
"اللہ عزیز ہے" یعنی قوی ہے جو ان کے صفات نفسانی
کو ذلیل کرکے خود انھیں مقہور و ذلیل بناتا ہے حصول
کمال کا بڑا شوق ہے۔ مگر ہمیشہ کے لئے اس کمال سے
محروم ہوگئے اللہ اسی آگ میں انھیں جلاتا ہے۔

یجازیھم بما یناسبھم من العذاب الذی اختاروہ لانفسھم بدواعیھم الغضبیۃ والشھویۃ وغیرھا ومیولھم الی الملاذ الجسمانیۃ فلذلک بدلوا حجباً ظلمانیۃ بعد حجب ؎

"اللہ حکیم ہے"، وہ اپنی حکمت سے ان کو وہی سزا دیتا ہے جو اس عذاب کے مناسب حال ہے جسے خود انھوں نے اپنے لئے پسند کیا ہے، اپنے محرکات غضب و شہوت و میل طبیعت و لذات جسمانی میں انہماک سے اس عذاب کو انھوں نے اپنے لئے خود ہی پسند کیا، لہٰذا ہر بار تاریک پردوں کے بعد دوسرے دوسرے تاریک پردے اُن پر تبدیل ہوتے رہے۔ ؎

شیخ اکبر کی اصل عبارت کے ساتھ اُردو میں صرف تلخیص و توضیح پر نظر ہے۔ اہل نظر اندازہ کرسکتے ہیں کہ تبدیل جلود" کا منطوق چاہے کچھ ہو مگر آیہ شریفہ کو کم از کم تناسخ سے کوئی سروکار نہیں اور نہ تفسیر سے کہیں اس کا شائبہ نکل سکتا ہے کیوں کہ تعلیم الٰہی کو تناسخ سے بشدت انکار ہے۔"

؎ تفسیر ابن عربی۔ طبع بمبئی۔ ۱۲۹۱ھ ج ۱ ص ۱۵۲۔

نفیس دعوتی کارڈ مختلف رنگوں اور دلکش طرزوں کے کافی تعداد میں موجود ہیں خریدنے سے پہلے ایک بار ضرور ملاحظہ فرمائیے۔

سامان نوشت و خواند ہر قسم کا بہتر سے بہتر موجود ہے۔ تھوک اور چلر دونوں طریقوں سے فروخت کیا جاتا ہے۔

فضل فوئنٹین پن جدید اسٹاک آگیا ہے۔ جونیر ۔ للعہ ۔ سینیر عہ ۔

فدا علی محمد علی

جنرل اسٹیشنری مرچنٹ ۔ پتھر گٹی ۔ حیدرآباد

ٹیلیفون ۶۵

نقد و نظر

سُبُل السّلام

مولفہ خواجہ محمد عبدالحی صاحب فاروقی استاذ تفسیر و ناظم دینیات جامعہ ملیہ اسلامیہ ضخامت ۸۶ صفحہ۔ قیمت ۱۲ ار۔ ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ دہلی۔

یہ خواجہ صاحب کی تفسیر قرآن کا وہ حصہ ہے جس میں اٹھائیسویں پارے (قد سمع اللہ) کی تفسیر کی گئی ہے۔ اس سے پہلے خواجہ صاحب سورہ آل عمران سورہ انفال و توبہ، سورہ یوسف، سورہ نور، سورہ حجرات اور پارہ عم کی تفسیریں شایع کرچکے ہیں۔ ان کا طرز تفسیر یہ ہے کہ وہ پہلے ہر سورہ پر ایک مقدمہ لکھتے ہیں جس میں اس کے موضوع کو واضح کر دیا جاتا ہے۔ پھر ایک ایک مضمون کی آیات کو الگ الگ لے کر ان کا صاف سلیس ترجمہ کرنے کے بعد ان کی تفسیر اور ان مسائل کی توضیح و تشریح کرتے ہیں جو ان آیات میں بیان ہوئے ہیں۔ لغت اور ادب کے نکات سے تعرض نہیں کرتے نہ شکوک اور شبہات پیدا کر کے ان کو رفع کرتے ہیں۔ کلام اللہ کا صاف اور سیدھا مفہوم بیان کر دیتے ہیں جو دراصل کلام کا اصل مقصود ہے۔ حسب موقع آیات کی شان نزول بھی بیان کرتے جاتے ہیں، جس سے کلام کا مقصود اور زیادہ واضح ہو جاتا ہے۔ عام لوگوں کے لئے یہ طرز تفسیر بہت مفید ہے۔ کیونکہ اس میں پیچیدہ بحثیں نہیں ہوتیں۔

بعض مقامات پر خواجہ صاحب حد اعتدال سے تجاوز بھی کر گئے ہیں۔ مثلاً قَدْ سَمِعَ اللّٰہُ قَوْلَ الَّتِیْ تُجَادِلُکَ کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:۔

انسان اور اس کے اللہ کے درمیان کسی رابطہ کی ضرورت نہیں۔ وہ خود ہر انسان کی بات سنتا ہے۔ اس آیت سے اُن جاہل مسلمانوں کو سبق لینا چاہئے جو پیر پکڑنا ضروری خیال کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس کے بغیر انہیں تقرب الی اللہ حاصل نہیں ہو سکتا۔"

اس بیان سے پیر پرستی کا رد مقصود ہے، مگر تردید کے جوش میں مفسر نے باطل کے ساتھ حق کی بھی تردید کردی۔ اللہ تعالیٰ سے دعا کرنے میں اس کے پیاروں کو وسیلہ بنانا بلکہ توسل کا التزام کرنا بھی کوئی ناجائز فعل نہیں ہے۔ اور نہ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ توسل کرنے والا خدا کے سمیع الدعا اور قاضی الحاجات ہونے پر اعتقاد نہیں رکھتا۔ بخاری شریف میں یہ واقعہ منقول ہے کہ جب کبھی امساک باران ہوتا تو سیدنا عمر ابن الخطاب رضی اللہ عنہ، حق تعالیٰ سے عرض کرتے کہ "خدایا پہلے ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو وسیلہ بناکر تجھ سے پانی برسانے کی دعا کرتے تھے اور تو پانی برسا دیتا تھا۔ اب ہم تیرے نبی کے چچا کو تیرے پاس وسیلہ بناتے ہیں۔ تو ہم پر پانی برسا دے"۔ عام الرمادہ میں جب سخت قحط پڑا تو حضرت عمر نے خطبہ دیتے ہوئے فرمایا کہ "لوگو! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عباس کو اپنے والد کی جگہ سمجھتے تھے تم بھی اپنے رسول کی پیروی کرو اور انہیں اللہ کے پاس وسیلہ بناؤ"۔ خود حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ جب لوگوں کی درخواست پر دعاء باراں کرتے تو ان الفاظ کے ساتھ کرتے کہ "خدایا تیرے نبی کے ساتھ مجھ کو جو تعلق ہے اس کی بنا پر قوم مجھے تیرے حضور لائی ہے"۔ علامہ ابن حجر عسقلانی ان واقعات کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ عباسؓ کے قصہ سے یہ بات نکلتی ہے کہ اہل خیر و صلاح اور اہل بیت نبوت سے سفارش کرانا مستحب ہے" (دیکھو فتح الباری جلد ۲۔ صفحہ ۳۳۹) صحابہ رضوان اللہ علیہم کے اس فعل سے جو بقول حضرت عمر خود عہد رسالت میں بھی ہوتا تھا، ثابت ہو گیا کہ توسل بجائے خود اسلام کے خلاف نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایک طرح سے اپنی گنہگاری پر ندامت و شرمساری کا اظہار ہے کہ خدا کے سامنے براہ راست اپنی درخواست پیش کرتے ہوئے شرم آتی ہے، اور اس کے پیاروں کو وسیلہ بناکر حاضر دربار ہوتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی جاہل کسی فاسق کو صالح سمجھ کر اسے وسیلہ بنائے تو یہ البتہ قابل اعتراض ہوگا۔ مگر نفس توسل کی بنا پر نہیں بلکہ انتخاب وسیلہ میں غلطی، اور فاسق کو صالح سمجھنے کی بنا پر۔ اسی طرح اگر کوئی شخص یہ خیال کرے کہ بغیر توسل کے خدا کسی کی دعا سنتا ہی نہیں، تو یہ بھی غلط ہوگا

سرور دو عالم (صلی اللہ علیہ وسلم) | تالیف فضل کریم خاں صاحب درانی۔ بی۔ اے | تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ ضخامت ۱۹۷

صفحات۔ قیمت مجلّد عہ، غیر مجلد عہ۔ ملنے کا پتہ پکو آرٹ پریس، موچی دروازہ لاہور۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارک پر ایک مختصر سی کتاب ہے جو عورتوں اور بچوں اور کم سواد لوگوں کے لئے لکھی گئی ہے۔ مؤلف نے دیباچہ میں اس کا مقصد یہ بتایا ہے کہ "ضرورت تھی کہ مطبوعات پکو کی طرز پر ایک نہایت عام فہم دلچسپ اور مختصر مگر جامع کتاب لکھی جائے جس سے ہر شخص فائدہ اٹھائے۔ اور نہ صرف بڑے ملکہ بچے اور عورتیں بھی اسے چٹکیاں لے لے کر پڑھیں" لیکن نبی علیہ الصلاۃ والسلام کی سیرت طیب وطاہر اس سے بہت بلند و برتر ہے کہ اس کو "چٹکیاں بجا بجا کر پڑھا جائے۔ بلاشبہ ایسی مختصر کتابیں لکھی اور بکثرت شائع کی جانی چاہئیں جو عام فہم ہوں۔ اور جن سے عوام حتیٰ کہ بچے اور عورتیں بھی فائدہ اٹھا سکیں، لیکن ان کے لکھنے کا انداز ایسا ہونا چاہئے کہ ان کو ادب و احترام کے ساتھ پڑھا جائے نہ کہ "چٹکیاں بجا بجا کر"۔

کتاب عام فہم ضرور ہے لیکن زبان و بیان لائق اصلاح ہیں صفحہ ۵۵ پر لکھا ہے: "بڈھا دادا عبد المطلب ابھی زندہ تھا۔ دادا کو پوتے سے بہت محبت تھی چنانچہ عبد المطلب آپکی پرورش کرنے لگا۔ لیکن وہ عمر کے اسی برس آگے ہی پورے کر چکا تھا" یہ انداز بیان نہایت نازیبا ہے اسی طرح ایک جگہ لکھا ہے: "عیسیٰ ہو یا موسیٰ آپ کا پایہ سب سے اونچا ہے" اول تو انبیا علیہم السلام کے درمیان تقابل ہی درست نہیں ہے خود نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا ہے۔ پھر اگر تقابل کرنا بھی تھا تو اس انداز میں نہ کرنا چاہئے تھا جس سے دوسرے انبیاء کا استخفاف ہوتا ہو۔ جو کتاب عوام کے لئے لکھی جائے اس میں تو انبیا علیہم السلام کی عظمت و بزرگی کا نقش دلوں میں بٹھانا اور بھی زیادہ ضروری ہے۔

مکتبۂ علمیّہ

ایک مکمل تجارتی کتب خانہ ہے جہاں سے ہر مذاق اور ہر علم و فن کی اردو، عربی، فارسی اور انگریزی کتابیں مل سکتی ہیں۔ طلبا کے لئے درسی کتابوں کا بھی انتظام کیا گیا ہے۔ بیرونی مقامات کے لوگوں کو بھی حسب فرمایش کتابیں بھیجی جاسکتی ہیں۔

مکتبۂ علمیّہ۔ چار مینار حیدرآباد دکن

قواعد

رسالہ "ترجمان القرآن" بالعموم ہر ہجری مہینے کی ۱۰ تاریخ کو شائع ہوا کریگا مہینہ کی ۲۵ تاریخ تک جن حضرات کے پاس پرچہ نہ پہنچے وہ دوبارہ لکھکر منگوا سکتے ہیں ختم ماہ کے بعد دوسرے مہینے کی ابتدا میں جن خریداروں کی شکایات موصول ہوں گی انکو پرچہ قیمتاً دیا جائے گا۔

جو حضرات اپنی جائے قیام کسی طویل مدت کے لئے تبدیل کریں انہیں اپنے جدید پتے کی اطلاع دفتر کو بھیج دینی چاہئے ورنہ پرچہ نہ پہنچنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

خریداروں کو دفتر سے مراسلت کرنے میں ہمیشہ نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دینا چاہئے لیکن یہ لحاظ رہے کہ رجسٹر نمبر اور چیز ہے اور نمبر خریداری اور چیز۔

اشاعت کے لئے مضامین اور حل طلب مسائل تمام اڈیٹر کے نام سے بھیجے جائیں لیکن اڈیٹر پر لازم نہیں ہے کہ ہر چیز شائع کرے۔

مینیجر ترجمان القرآن۔ خیرت آباد۔ حیدرآباد (دکن)

(طابع و ناشر ابوالاعلیٰ مودودی) مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس چار مینار حیدرآباد دکن

آپ کا کتب خانہ

کون کونسی کتابوں سے خالی ہے؟

ان کا جواب اُن الماریوں سے ملے گا جن میں آپ کی کتابیں چنی ہوئی ہیں۔ نئی دنیا پرانے نظریوں کے متعلق کیا رائے رکھتی ہے۔ اس دور کے مصنفین ہمارے سامنے کیا نئی باتیں پیش کر رہے ہیں۔ شاہراہ ترقی پر کون کس سے آگے ہے اور پہلے کہاں تھا؟ ان تمام سوالات کے جواب آپ کو اپنے کتب خانہ سے ملنے چاہئیں۔ مگر یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ آپ اپنے ذخیرے پر پوری توجہ رکھیں۔ آج آپ اسی نظر سے اپنے کتب خانہ کو دیکھئے۔ اور جو کچھ کمی ہو اسے پورا کرنے کے لئے ہمارے کتب خانے کو لکھئے۔ جہاں عربی، فارسی، اور خصوصاً اردو زبان کی تمام علمی ادبی تاریخی اور فنی جدید و قدیم تصنیفات نہایت تلاش اور جستجو سے مہیا کی جاتی ہیں اور اکثر کمیاب قدیم تصانیف نہایت اہتمام سے خود طبع کرا کر پیش کی جاتی ہیں علاوہ بریں۔

درسی کتابیں منظور شدہ سررشتہ تعلیمات سرکار عالی از انفنٹ تا بی۔ اے کلاس زبان عربی۔ فارسی۔ اردو انگریزی مرہٹی تلگو کنڑی وغیرہ نیز کنڈر گارٹن ماڈل کے مینٹ و نقشہ جات دیواری رنگین ہر قسم کے و چارٹس اسباق الاشیاء وغیرہ مدارس کے و دیگر دفاتر کے فارمس اور ڈرائنگ کا سامان بالکل واجبی قیمتوں پر حاصل کیجئے

سید عبد القادر تاجر کتب

مالک اعظم اسٹیم پریس گورنمنٹ ایجوکیشنل پرنٹر

چار مینار حیدرآباد دکن